

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_224508**

UNIVERSAL  
LIBRARY









تصنیف

اسلامی فن تعمیر

ہندستان میں

تصنیف

جیمس فرگسن

سی۔ آئی۔ ای۔ ڈی۔ سی۔ ایل۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ آئی۔ بی۔ لے

ترجمہ

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

مرکن شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

۱۹۳۲ء

طبع

یہ کتاب مشہر جان مڑے پبلشر (لندن) کی اجازت سے جس کو  
حق اشاعت حاصل ہے۔ اردو میں ترجمہ کر کے  
طبع و شائع کی گئی ہے۔

# فہرست مضامین

”اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں“

صفحہ نمبر	مضامین	ابواب	نمبر
۸ تا ۸	مقدمہ	باب ۱	۱
۹ تا ۱۴	غزنی: مقبرہ سلطان محمود۔ سومات کے کوہ۔ میدان کے مینار۔	باب ۲	۲
۱۵ تا ۲۸	(شیرک و) پٹھان بادشاہ: پرائی دہلی کی مسجد۔ قطب مینار۔ علاء الدین کا مقبرہ۔ پٹھان بادشاہوں کے مقبرے۔ ان کی تزئین و	باب ۳	۳
۲۹ تا ۵۵	جوئیور: جامع مسجد اور لال دروازہ	باب ۴	۴
۵۸ تا ۷۲	نجات: احمد آباد کی جامع مسجد اور دوسری مسجدیں۔ سرکیتج اور بٹوا کے مقبرے اور مسجدیں	باب ۵	۵
۷۷ تا ۸۵	اضلاع کی عمارات۔	باب ۶	۶
۸۶ تا ۹۲	مالوہ: دھار۔ منڈو کی بڑی مسجد۔ محلات۔	باب ۷	۷
۹۳ تا ۱۰۳	بنگالہ: بنگالے کی چھتیں۔ مسجد قدم رسول۔ گور مسجد سونا۔ آدینہ واک لاکھی: مالدہ۔ مینار۔ بڑے دروازے۔	باب ۸	۸
	گلبرگہ: مسجد گلبرگہ۔ مدرسہ بید۔ مقابر۔	باب ۹	۹

۹	باب ۹	بیجا پور جامع مسجد۔ ابراہیم محمود کے مقبرے۔ دیوان عام۔ ہتھری محل۔ گولکنڈے کے گنبد۔ نواب امین خاں کا مقبرہ۔	۱۲۳ تا ۱۲۴
۱۰	باب ۱۰	مغلیہ طرز تعمیر کے شاہی خاندان۔ مقبرہ محمد غوث گوالیاری۔ مسجد چھوڑ سیکری۔ اکبر کا مقبرہ۔ دہلی محل۔ روضہ ممتاز محل۔ موتی مسجد۔ دہلی کی مسجد مارتنیری بیگم کوٹھی اور لکھنؤ کا امام باڑہ۔ موت کی انگریزی بتیاب۔ جونا گڑھ کا مقبرہ۔	۱۲۴ تا ۱۸۹
۱۱	باب ۱۱	چوہی طرز تعمیر مسجد شاہ ہمدان، سری نگر (کشمیر)	۱۹۰ تا ۱۹۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں

## باب اوّل

### مقدمہ

بہت قدیم زمانے سے بحرِ متوسط اور دریائے سندھ کے درمیان مغربی ایشیا کے علاقے میں متمدن قوموں کا ایک بڑا گروہ آباد تھا جو الگ تھلگ رہتا اور سوائے جنگ اور عداوت کے اپنے ہمسائوں سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ اس کے ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف یورپ کی قومیں رستی بستی تھیں مگر مذکورہ بالا گروہ انہیں قریب لانے کے بجائے کچھ کرتا تھا تو ایک دوسرے سے علیحدہ اور دور ہی کرتا تھا۔

سکندریونانی کی زبردست یورش پہلی کوشش تھی کہ یہ سید فاصل توڑ کر مشرق و مغرب کو تجارتی اور تمدنی تعلقات کے ذریعے ملایا جائے اور اس ذہین و ذمی حوصلہ فاتح نے

جو نقشہ ڈالا تھا، اسے ویدالکبری کی بتدریج وسعت و تنظیم نے عملاً پورا کر دکھایا اور جب تک اس کی سیادت قائم رہی، اس وقت تک مغربی ایشیا کی اقوام میں امن و انتظام رہنے سے یورپ اور ہندوستان کے درمیان آمد و رفت کا راستہ کھل رہا اور بظاہر کوئی وجہ نہ معلوم ہوتی تھی کہ اس میں خلل پڑ جائے گا۔ لیکن رومی دنیا کو یہ خبر نہ تھی کہ اس طویل راستے کے دونوں جانب دو بدوی قویں ایسی موجود ہیں جن پر رومی تمدن کا سایہ تک نہیں پڑا اور جو تاک میں بیٹھی ہیں کہ سلطنت روم میں کمزوری آتے ہی اس سے فائدہ اٹھالیں۔

ان میں عرب زیادہ بے باک و جری اور مرکز سے نزدیک تر تھے اور اپنی حدود سے اول انہی نے قدم باہر نکالا۔ ساتویں صدی عیسوی میں وہ دشت عرب سے نکل کے شام، ایران، مصر اور شمالی افریقہ پر چھان گئے۔ اڈلس پران کا تسلط ہو گیا اور ہندوستان بھی ان کے قبضے میں آنے سے ذرا ہی بچ گیا۔ انویوں کے پہلے خلیفہ امیر معاویہؓ کے عہد میں جنوب کی طرف سے دریائے سندھ کو عبور کرنے کی کوشش ہوئی اور یہ وہ راستہ تھا جس سے تھوڑی مدت پہلے سیتھی قویں ہندوستان میں در آئی تھیں۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی البتہ خلیفہ ولیدؓ کے زمانے میں محمد ابن قاسم کے ماتحت عرب سندھ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۳۹ھ - ۱۳۷ھ) ماس ہمدیہ فتح غیر مشروط ثابت ہوئی اور گویاں ایک مسلمان خاندان کی حکومت قائم ہو گئی تھی لیکن یہ خلافت کی ماتحتی سے تھوڑے ہی دن بعد آزاد اور آخر میں خود بنے نشان ہوئی۔ عربی خلافت کی سیادت جس قدر درخشاں تھی اسی قدر محدود و ناپائیدار ثابت ہوئی۔ اس کے انتہائی عروج کا وقت سنہ ۷۵۰ء کے قریب سمجھنا چاہئے جب کہ ہارون رشید وارث تاج و تخت تھا۔ اس کے بعد انحطاط شروع ہو گیا اور منصف فساد جو ایشیا کے شاہی خاندانوں کی خصوصیت ہے اس قدر بڑھے کہ دو صدی بعد شمالی گروہوں کو ہاتھ پاؤں نکالنے کی جرات ہو گئی۔

یہ گیارہویں صدی مسیحی کا ذکر ہے کہ تاتاری لشکر جبال قہستان کے جنوب میں نمودار ہوئے جن کی نسبت اس وقت تک صرف یہ علم تھا کہ وسط ایشیا کے کوہستانی جنگلوں میں مویشی چراتے پھرتے ہیں۔ مگر آئندہ چھ سو برس تک ان کا قدم برابر بڑھتا رہا حتیٰ کہ



سلسلہ میں ہم ترکوں کو متی آنا کی شہر پناہ کے سامنے خیمہ زن دیکھتے ہیں۔ مثل بادشاہ اورنگ زیب سارے ہندوستان پر فرماں روائی کرتا ہے اور متصر اور بیچ کے سب ملک تورانی نژاد بادشاہوں کے زیرِ نگیں نظر آتے ہیں۔  
 خلافت عربی کے تحت میں جو تو میں تھیں ان کی عمارات کا دوسرے مقام پر ذکر آچکا ہے اور یہ بہت کم وقعت رکھتا ہے بلکہ ان کے فرماں روا سامی نسل کے تھے اور انھیں تعمیرِ شان و شوکت کا کوئی خاص مذاق نہ تھا اور بجز اس صورت کے کہ ان کی حکومت کسی غیر نسل کے لوگوں پر ہو انھوں نے فن کی بہت کم یادگاریں چھوڑی ہیں۔  
 شمالی حملہ آوروں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ یہ کم و بیش خالص تورانی نسل کے لوگ تھے اور جہاں پہنچے وہاں مساجد اور خاص کر مقابر ان کے جاہ و جلال کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ دوسرے نقطوں میں یوں کہنا چاہیے کہ سامی فتوحات جن کا مرکز مکہ (مظلمہ) تھا، وادی الکبیر سے لے کے وادی سندھ تک پھیلیں مگر فنِ عمارت میں بہت کم چیزیں انھوں نے یادگار چھوڑیں۔ خلافت اس کے تورانی فتوحات بلخ و بخارا کے مرکروں سے استنبول و ککلت تک وسیع ہوئیں اور اس تمام علاقے کو ہر قسم کے آثار سے معمور کر دیا۔ ان میں سے مغربی اور وسطی ممالک کی عمارات کا ذکر ترکی و ایران کے حال میں عرض کیا جا چکا ہے۔ مشرقی شعبہ باقی ہے اور اسی کی یادگاریں ہمارے بیان کا موضوع ہیں۔  
 ہندوستان کے اسلامی مہماروں نے یہاں بھی جہاں جا کر بسے وہاں کے دینی

سلسلہ میں ملوکِ سلطانین کا بادشاہ ہونے تک، مہار نے فنِ تعمیر کا بہت کم ذوق دکھایا اور ایران میں اسلامی فنِ عمارت کا آغاز ہی غلام بلجیویوں کے عہد (سلسلہ ۱۷۰۰ء) سے ہوتا ہے۔ سلسلہ اس فقرہ کا مطلب صاف نہیں ہے۔ غالباً مصنف کا یہ کہنا تو صحیح ہو گا کہ دو تین ملکوں کے سوا غیر عربی ممالک میں عربی نسل بادشاہوں نے تعمیر پر چنداں توجہ نہیں کی۔ درنہ شام و فلسطین، مصر و عراق اور خود حجاز میں ان کے آثار صدائے تعداد و شان و شوکت میں کچھ کم نہیں ہیں۔ (مترجم) سلسلہ یہ قول تاریخ و تحقیق دونوں سے عاری ہے اور اس کی تکذیب میں صرف لبنان کی شہرہ کتاب "تدین عرب" کا حوالہ دینا کافی نظر آتا ہے۔ مترجم سلسلہ "ہٹری ادف امینٹ۔۔۔۔۔ آر کی ٹیکچر" ملے سوم۔ جلد دوم، ص ۵۵۶ نو

باشندوں کے طرز اخذ کرنے میں اسی سلاجیت کا ثبوت دیا جیسا کہ مذکور بالا ممالک میں دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں ہمہ اسلامی فن عمارت کے کمرے کمر بارہ یا پندرہ طرز پائے گئے ہیں اور اگر زیادہ جامعیت کے نظر ڈالی جائے تو اور زیادہ قسمیں نکلائی جائیں گی لیکن سردست ہمارے مقصد کے لئے غالباً ذیل کی تیر قسمیں کافی ہونگی :

۱۔ ان میں سب سے پہلو طرز غزنی کا ہے کہ گومہیج یعنی میں وہ ہندوستان میں داخل نہیں تاہم ہندوستان کے طرز ہائے عمارت پر یقیناً اس کا بڑا اثر پڑا اور حقیقت میں مغربی طرز تعمیر کے ہندوستان تک پہنچانے میں اسی نے سب سے کام دیا۔ جبکہ عرصہ دراز تک مغربی اور مشرقی دنیا کی عمارات کے درمیان وہ حلقہ موصل بنا رہا۔ نظریں ہندوستان خاص کے ابتدائی طرز تعمیر کے سمجھنے میں اس غزنوی طرز سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے بشرطیکہ خود اسے مہم صحت و درستی کے ساتھ بیان کر سکیں لیکن اس کے لئے نہیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا کہ کوئی صاحب فن آدمی اس موضوع کی سیاحت کرے یا

۲۔ اس کے بعد شمالی ہندوستان کا "پٹھان" یا ترک کی طرز عمارت (راؤ سلالہ تاسٹ) ہے جس کی مدت زمانی سارے تین سو پچیس اور چالیس سالہ ہندوستانی پر وسیع ہے لیکن سلطان علاء الدین محمد غزنوی کی وفات ۶۰۲ھ کے بعد مرکزی حکومت بعض اوقات اتنی کمزور ہو جاتی تھی کہ نو قبچوقا اور در دست موہا آزاد ہو بیٹھتے تھے اور جب یہ بہتا تو سرکشی کرنے والے حکماء سرسہرات میں اپنی بند کھوپڑیاں شعلہ بستی کا اظہار کرتے اور فن تعمیر میں بھی جدت دکھاتے جس میں مقامی خصوصیات جھلکتی تھیں :

۳۔ سب سے اولیٰ ایسی جدت طرازی دکھانے والوں میں جوہنور کا رشتہ رقی نامزدان تھا جس کا عہد حکومت اکبر غرناٹہ و جلال (راؤ سلالہ تاسٹ) اور اس ایک صدی سے بھی گہم کی مدت میں اس نے اپنے پائے تخت اور دوسرے ٹھہروں کو مہیا اور ایسے سلسلہ عمارات سے مزین کر دیا جو شان و شوکت میں ہندوستان کے

سے منف کی مراد سلطان علاء الدین غلہی سے ہے ہر قریب

کسی دوسرے شہر یا علاقے کی عمارات سے شاید ہی کمتر ہوں گی اور اپنے نمایاں طرز خاص کے اعتبار سے تو یقیناً کسی سے گنتی ہوئی نہیں ہیں :

۴۔ شاہان گجرات کا طرز تعمیر جو انھوں نے اپنے خود مختاری کے زمانے (۱۲۹۹ء تا ۱۵۲۶ء) میں اختیار کیا۔ زیب و زینت اور تنوع میں جو تپور سے بھی بڑھ کر ہے۔ لیکن اس میں آئینی جدت اور شان نہیں پائی جاتی۔ ان بادشاہوں نے صورتی اور منوئی لحاظ سے اکثر اجزا ہندووں اور جینیوں کی عمارات سے مستعار لئے ہیں جن میں وہ رہتے سیتے تھے۔ بایں ہمہ انھوں نے جس قدر ہندوانی جزئیات اخذ کی ہیں اسی مناسبت سے ان کے طرز تعمیر میں حسن و زیبائش بھی موجود ہے :

۵۔ مالوہ سلطنت میں آزاد ہوا اور ۱۵۶۹ء میں سلطنت مغلیہ میں جذب ہو گیا۔ اس دوران میں یہاں کے بادشاہوں نے اپنے دارالامک منڈو کو نہایت عالیشان تصور و مساجد سے زینت بخشی لیکن طرز تعمیر کے اعتبار سے جو پور و گجرات کی نسبت یہاں کی عمارتیں دہلی کے ماخذ اصلی سے زیادہ مشابہتیں لہذا ان میں اتنی مقامی خصوصیت اور شان اثنا زمی پیدا نہ ہوئی :

۶۔ بنگالہ بہت پہلے یعنی ۱۲۰۰ء ہی میں مستقل سلطنت بن گیا تھا اور مرکزی حکومت سے ۱۵۸۵ء تک نرم و میس آزاد رہی رہا۔ اور اس عرصے میں اس کے پائے تخت گور و والدانہایت پر شکوہ عمارات سے مزین ہو گئے۔ یہ عمارتیں عام طور پر اینٹ کی تھیں اور مرور زمانہ سے وہاں جنگلی درختوں کی ایسی کثرت ہوئی کہ یا تو وہ خراب شکستہ ہو گئیں اور یا اب نظر نہیں آتیں۔ باوجود اس کے ان کا تنوع سب سے بڑھا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ نہایت ممتاز اور واضح طور پر جداگانہ طرز تعمیر کے جملہ عناصر ان میں پائے جاتے ہیں :

زبد اس کے شمال میں اسلامی طرز تعمیر کی یہ چھمیں کر وینا، غالباً کافی ہے۔ مگر اس دریا کے جنوب میں واضح طور پر تین جداگانہ قسمیں الگ ہیں :

۱۔ پہلی قسم، خاندان جہنوی کی عمارتوں کی ہے جس نے اول گلبرگہ (۱۲۸۰ء) اور بعد میں بیدر (۱۲۸۵ء) کے پائے تخت کو شاندار عمارتوں سے آراستہ کیا۔ ان کا طرز بالکل علیحدہ اور ممتاز ہے اور یہ سلسلہ تعمیر جاری رہا تا آٹھ ۱۵۰۰ء میں مغلوں کی

وسیع سلطنت میں یہ علاقے ضم ہو گئے تھے

۸۔ اس کے بعد مگر خاندان بہمنی سے بھی زیادہ مشہور بیجا پور کا عادل شاہی خاندان ہے (سلسلہ تاسیس ۱۶۷۱ء) اس کا طرز تعمیر مذکورہ بالا تمام قسموں سے جملہ خصوصیات میں الگ ہے اور علوے خیال اور بہت تعمیر میں ہندوستان بھر کی عمارتوں سے واضح امتیاز رکھتا ہے ؎

۹۔ تیسرا جنوبی طرز گوکنڈے کے قطب شاہی خاندان (سلسلہ تاسیس ۱۶۷۱ء) کا ہے۔ ان بادشاہوں کے مقبرے بڑے شاندار ہیں اور ہندوستان کے سب سے قابل دید مجموعوں میں داخل ہیں۔ ان میں انخطاط کی علامتیں موجود ہیں جو بے شبہ ان کے زمانہ تعمیر میں فن پرسلط ہوتا جاتا تھا ؎

۱۰۔ یہ سب ممتاز خصوصیات یکے بعد دیگرے غلوں کی وسیع و عظیم سلطنت میں ضم ہو گئیں جسے سلسلہ میں آہر نے قائم کیا اور جو اورنگ زیب کی وفات کے وقت حملہ آباد ہوتے جانے کے باوجود کہہ سکتے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے وسط (یعنی ۱۷۵۷ء) تک سلامت رہی۔ یہی خاندان ہے جس کی بدولت اگرہ دہلی اور شمالی ہند کے اکثر شہروں کی سب سے شاندار عمارتیں معرض وجود میں آئیں ؎

۱۱۔ اپنے معنوں کے اس شعبے کو ختم کرتے وقت، مسندھ کے اسلامی فن تعمیر کو شمار کر لینا مناسب ہوگا۔ وضع اور آراستگی میں یہ قریب قریب بالکل ایرانی سے اور یقیناً بہت قدیم زمانے سے اس صوبے میں موجود ہوگا لیکن اس کی جس قدر مثالیں معلوم ہیں، وہ نسبتہ قریبی مہد کی ہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ ان سے ہم پھر غزنی کی نواح میں پتہ چلتے ہیں، جہاں سے یہ سلسلہ آغاز کیا تھا ؎

۱۲۔ یہ تو قسمن قسمن انہیں اسلامی طرز تعمیر کا صحیح نمونہ کہنا چاہئے مگر ان کے سوا دو طرز اور ہیں جنہیں دوغلا کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے پہلا آدوہ کا ہے (سلسلہ تاسیس ۱۶۷۱ء)

۱۹۰

۱۳۔ سلسلہ میں خاندان بہمنی کا خاتمہ تو ہو گیا تھا لیکن سلطانین منیلہ کا دکن میں عمل دخل تقریباً ایک صدی کے بعد ہوا ؎ مترجم ۱۷۵۷ء صفحہ ۱۷۵۷ء نے یہ سنہ بھی غلط لکھا ہے بیجا پور کا اسحاق ۱۷۵۷ء کی بات ہے ؎ مترجم ۱۷۵۷ء قطب شاہی خاندان کا خاتمہ ۱۷۵۷ء میں ہوا نہ کہ ۱۷۵۷ء میں ؎ مترجم -

۱۸۴۱ء جس کے پائے تخت میں عمارتوں کے ایسے سلسلے موجود ہیں جو وسعت و آراستگی میں مذکورہ بالا صدر مقامات کی عمارتوں کے ہم پلہ ہیں لیکن ان سے بانوں کا ذوق اس درجہ گرا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس قوم کے منسوب کرنا بھی مشکل ہے جو تھوڑا ہی زمانہ پہلے ایسے ایسے عالی ہستی کے کرشمے دکھائی تھی کہ

۱۸۴۱ء میٹور کی چند روزہ بادشاہی (۱۸۴۱ء تا ۱۸۴۹ء) نے جو طرز اختیار کیا وہ یورپی بد ذوقی کے اثرات سے ذرا زیادہ دور تھا اور وہ اتنا ذلیل نہیں ہے جتنا لکھنؤ کا طرز عمارت۔ بایں ہمہ پہلے نمونوں کے مقابلے میں یہ بہت ادنیٰ اور برنما ہے۔

اس مضمون پر زیادہ جامع کتاب لکھی جائے تو غالباً احمد نگر، اورنگ آباد (۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۷ء) اور بعض دوسرے کم درجے کے طرز ہائے عمارت بھی شمار کرنے ضروری ہوں گے لیکن یہ اس قدر ممتاز نہیں ہیں کہ انہیں جداگانہ طرز سمجھا جائے اور ہم اپنی اس کتاب میں جس حد تک تصاویر سے کام لے سکتے ہیں، وہ اتنی وسیع نہیں ہے کہ ان کم درجے کے نمونوں کا فرق ان لوگوں کو محسوس ہو سکے جو ان علماء سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی کتابوں کے سوا دوسرا ذریعہ ملتا نہیں رکھتے، خود زیر بحث طرزوں کے سب سے ممتاز اوصاف اور خصوصیات ان کے ذہن نشین نہیں کئے جاسکتے جب تک کہ اس کتاب کی نسبت کہیں زیادہ تصویروں مہیا نہ کی جائیں۔ ان تیرہ میں سے ہر طرز ایک جداگانہ کتاب چاہتا ہے لیکن بجا پور، احمد آباد، جو پور اور فتح پور سیکری کے سوا اور کسی مقام کی عمارات پر ایسی

۱۸۴۹ء آرکیٹیکچرل بجا پور، از میلووئیل، فرگسن وغیرہ۔ ۱۸۶۶ء۔

۱۸۶۶ء " احمد آباد " ہوپ، فرگسن وغیرہ۔ ۱۸۶۶ء۔ یہاں کی اور عام طور پر گجرات کی اسلامی عمارات کے تفصیلی حالات آرکیولوجیکل سروے آف ویسٹرن انڈیا، کی مچھلی اور نویں جلد میں بھی ملیں گے۔

۱۸۶۶ء دہلی مشرقی آرکیٹیکچرل بجا پور، از آئسمہ وغیرہ۔ ۱۸۶۶ء۔  
۱۸۶۶ء اسی اڈیشن آف آئسمہ کی خانہ دار مصور کتاب مثل آرکیٹیکچرل بجا پور سیکری، نظر نماز نہ ہونی چاہیے۔

کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور ان چار مقامات پر بھی جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تمام ضروری معلومات اور مواد کا جامع نہیں ہے مگر ہمیں ایسا ہیہ کہنی چاہئے کہ ان کی کمی پوری کر دی جائے گی اور دوسرے مقامات پر بھی قبل اس کے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے، کتابیں تیار کر لی جائیں گی کیونکہ مرور زمانہ اور موسم کے تاراج کن ہاتھوں پر آثار قدیمہ جسد جلد برباد و مٹھو ہوتے جاتے ہیں اور ان سب سے بڑا کبر، ہندوستان کی چھوٹی ستھن، بیہودہ مداخلت اور نقصان رساں سرکاری اغراض کے لئے انھیں خراب بنے بھٹانے والی ہے۔

تعمیر حاشیہ منعمہ گزشتہ - اس کی چار جلدیں (جلد ۱ تا ۴) ۱۹۹۶ء اور ان میں ۱۲۰ پلیٹ کی تصویر ہیں اس میں صرف اسی مقام کے طرز عمارت پر جامع بحث کی ہے۔ اور اس کی دوسری کتاب "مغل کارڈیکوریشن آف آگرہ" (۱۹۹۸ء) بھی بعض عمارتوں کے نہایت عمدہ نقشے پیش کرتی ہے جو

# باب دوم

## غزنی

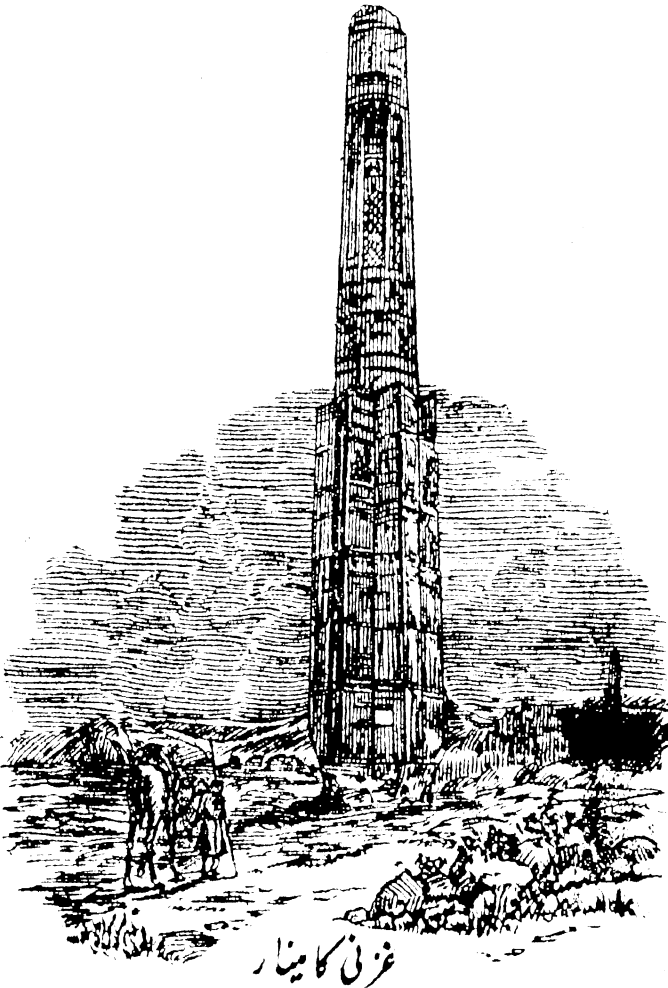
مقبورہ سلطان محمود - سومات کے کوڑا میدان کے مینار

### سین

سلطان محمود	۶۹۵
سلطان محمود	۶۹۹
سلطان محمود	۱۰۳۱
سلطان عبدالرشید	۱۰۴۰
سلطان ابراہیم	۱۰۵۵
سلطان شہاب الدین (خاندان غوری)	۱۲۰۶

نویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں خلیفہ بغداد کی قوت بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ ان منازل تک پہنچ رہی تھی جو عام طور پر ایشیا کے شاہی خاندانوں کے نصیب میں آتی ہیں۔ اکتھم کے عہد انتہائی کمزور تھا۔ اس کے بعد اس کی جگہ خلیفہ نصر احمد نے مقرر کیا تھا، بغداد کا طوق اطاعت اتار کر بھینک دیا۔ یہ والی ایک تاتاری سردار سا ان نامی کا پوتا تھا جس نے خود مختاری کا اعلان کیا اور سامانی خاندان کی بادشاہی کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کی حکومت کو تقریباً سو برس ہو گئے تھے جب کہ ایک سامانی سپہ سالار کے ترک غلام سلجوق نے بھی اپنے آقا سے انحراف کیا اور غزنی میں جہاں وہ صوبہ دار تھا، شہرہ آفاق غزنوی سلطنت قائم کر لی۔ اس کا جانشین بیٹا محمود ہندوستان کی تاج محل کے رستے نامور بادشاہوں میں ہے جس کا سبب ایک تو اس کے پیہم حملے تھے۔ دوسرے سومات کے مندر کو توڑنا خصوصیت سے اس کی شہرت کا باعث ہوا تو

فرشتہ کا بیان ہے کہ اپنے ایک حملے میں سلطان محمود نے شہر تھراکو تاراج کیا تھا  
وہیں غزنی آکے اُس نے نگ ساق و در کی ایک عالیشان مسجد بنانے کا حکم دیا جو بعد میں  
عروش فلک کے نام سے مشہور ہوئی اسی کے متصل سلطان نے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اور اُسے غزنی  
کو اپنے بادشاہ کا ذوق عمارت دیکھ کر تحریک ہوئی اور وہ اپنے محلات، و قصور، نیز فناء عام کی  
عمارات میں رفعت و شان کے اعتبار سے ایک دوسرے پر بقت لے جانے لگے۔ اسی طرح  
بقول مورخ، تھوڑے ہی دن میں یہ دار السلطنت مساجد و محلات، چاہ و تالاب، حوض و نہر کی کثرت  
اور خوشنالی سے ایشیا کے سب شہروں پر بازمی لے گیا۔



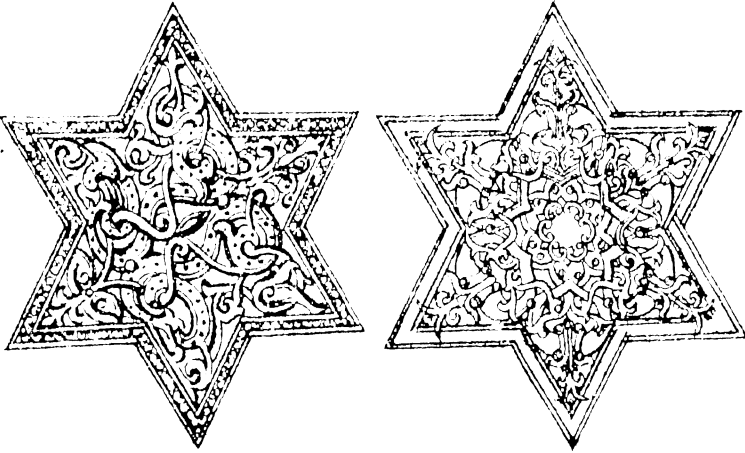
غزنی کا مینار



شہر غزنی کے میدان میں اس شان و زیبائش کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ اور چونکہ اس عہد کے ایرانی فنون و صناعات کی نسبت ہماری معلومات نہایت تشنہ ہے لہذا غزنی کے آثار باقیہ کا حال اور بھی زیادہ دلچسپ اور بیش قیمت چیز ہو گا۔ لیکن ان کھنڈروں کا ابھی تک نہ معائنہ ہوا نہ کسی نے ان کی کیفیت و تلبندگی کی ہے۔ حتیٰ کہ نام کے سوا ہمیں محمود اعظم تک کی قبر کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم نہیں ہے۔ حالانکہ اس ملک برطانی لشکر کی تباہی خیرمجم کے اخیر میں اسی مقبرے کے پھاٹک اکھاڑ کر ہندوستان لائے گئے تھے۔

یہ پھاٹک دیودار کے ہیں اور ان پر جو نقش کندہ ہیں وہ قاہرہ کی مسجد ابن طولوں اور وہیں کی دوسری ہمسر عمارتوں کے کام سے اس قدر مشابہ ہیں کہ نہ صرف ان کی ہمرسانی ثابت ہوتی ہے بلکہ

۹۳



سلطان محمود کی قبر غزنی کی نقاشی کے نمونے

سلہ بڑے انوس کی بات یہ ہے کہ انگریزی فوجیں غزنی گئیں اور کئی کئی بار وہاں سے گزریں گواں میں کوئی ایک بھی سروار ایسا نہ تھا جس میں اتنی قابلیت یا کچھسی ہوتی کہ وہ یہاں کے آثار قدیمہ کا معائنہ کرنا پسند ہے کہ آئندہ ایسا موقع آیا تو ان کی فوجی اہمیت نظر انداز نہ کیا جائے گی تو سلہ مشرقین نے اپنے طویل زمانہ فحاشان

یہ بھی کہ دینا سے اسلام کے اتنے بعید اقطاع میں ان دنوں نقاشی کے کس قدر یکساں طرز مقبول و مروج تھے ؟

اسی کے ساتھ ان میں کوئی چسپنا ایسی نہیں جو اس زمانے یا کسی زمانے کی بھی ہندوانی نقاشی سے ذرا بھی مشابہت رکھتی ہو۔ حقیقت اس میں شبہ کرنے کی مطلق گنجائش نہیں ہے کہ یہ کام اسی مقام پر ہوا تھا، جہاں سے یہ کواڑ ہاتھ آئے ہیں۔ مگر کے دوسرے حصوں میں بھی اسی قسم کے نقش و نگار ہوں تو ان کی تصویریں نکمال دلچسپی کا موجب ہوں گی لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اس جہد کے فنون کا بہترین مرقع جامع غزنی سے دستیاب ہوگا بشرطیکہ کوئی اس مسجد کو تفصیل سے جانچنے کی تکلیف گوارا کرے ؟

شہر کے باہر میدان میں ابھی تک دو خوشنما مینار موجود ہیں کہ غزنی کے آثار قدیمہ میں اگر سب سے زیادہ عجیب نہیں، تو کم سے کم سب سے ممتاز ضرور ہیں۔ یہ کسی مسجد کے مینار نہ تھے بلکہ حقیقت میں فتح و ظفر کی یاد گاریں ہیں جیسے چتوڑ وغیرہ ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور جن کا ایسے ملک میں ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے جہاں کچھ مدت پہلے برصغیر کا عرصے سے رواج رہا تھا۔ ان میں سے ایک خود محمود نے بنوایا اور دوسرے کی بنیاد تکمیل اس کے قریبی جانشین مستود کے زمانے میں ہوئی ؟

۱۔ بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ میں اس مقبرے کا جو نقشہ دیا ہے وہ محدود ایک رخا، اور غالباً زمانہ حال کی تعمیر کا ہے جس سے قدیم فن کا تفصیلی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں صرف دور کی محرابیں قدیم اور قدامت گیارہویں صدی کی۔ بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ؟ ۲۔ یہ روایت کہ یہ کواڑ صندل کے بنے ہوئے اور سموات کے مندر سے لائے گئے تھے، قطعی طور پر بے اصل و غلط ہے کیونکہ ان کی بکڑی سقاجی دیو دار کی اور طرز نقاشی ہندی نقاشی سے بالکل مختلف ہے ؟

۳۔ کرنل تول کی مکتوبہ "مارکو پولو ٹریولرز" (جلد دوم، ۳۹) میں ان کواڑوں کا بہت اچھا نقشہ دیا ہے ؟

۴۔ ان میناروں کے کتبات کے لئے دیکھو رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ جلد ۱۲، صفحہ ۷۷، ۷۸۔

ان میناروں کا نچلا حصہ ستارے کی شکل کا ہے جسے غالباً ایک مرتبہ پر دوسرا مرتبہ اڑا رکھکے بنایا ہے اور اوپر کا حصہ جو زمین سے ۴۰ فٹ اونچا ہے گولائی دے کے تعمیر کیا ہے۔ دونوں اینٹ کے ہیں مگر چونے گچ کے صندلے پر ایسی عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی کچی کاری کی ہے کہ آج تک نقش و نگار کے کنارے تک نہیں بگڑے ہیں تو اسی قسم کے مینار آگے مغربی ممالک میں، کوہ قفقاز کے دھنوں تک ملتے ہیں جو فتح مندوں نے جنگ کے میدانوں میں فتح کی یاد نگار رہنے کے لئے تعمیر کرائے تھے۔ مگر اپنی موجودہ حالت میں تو کوئی بھی حسن تعمیر کے لحاظ سے غزنی کے میناروں کے برابر نہیں ہے اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ان مغربی میناروں پر پسے ہوئے پتھر یا اور کسی ناپائیدار مصالحے کا صندل لایا گیا ہو جو اب اڑ گیا اور ان کا صرف ڈھانچا باقی رہ گیا جس سے ان کی اصلی حالت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔

سلطان محمود کے اخلاف کی کمزوری نے اہل ہند کو ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے تک چین سے رہنے دیا۔ ایشیائی خاندانوں کے معمول کے مطابق غزنوی بادشاہ بھی بتدریج اس خطاطی کے زینے طے کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک بادشاہ کی بدعنوانیوں نے اور بھی جلد اس حکومت کا خاتمہ کر دیا اور علاء الدین حسن نے اس کے جراثیم کی سزائیں سلطنت اور پائے تخت غزنی کی اینٹ سے اینٹ سجا دی۔ خاندان غزنوی کی جگہ آخر کار غوری بادشاہوں نے لی اور سلسلہ میں شہاب الدین محمد ابن سام اس ملک کا فرمانروا ہو گیا۔

مہرچند خاندان غزنوی کے بعد سے اب تک افغانستان میں صدیوں نظمی کا دور دورہ رہا ہے لیکن یہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ ان کی شان و شوکت کی سبھی یادگاریں محو بے نشان ہو چکی ہوں گی۔ بایں ہمہ جب تک ان کے شہروں کے معائنے اور عکسی تصاویر کا کام کوئی ایسا صاحب فن نہ کرے جو نیک و بد اور جدید و قدیم میں امتیاز کر سکتا ہو اس وقت تک ہم سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتے کہ اس طرز تعمیر کی اہمیت کا اظہار کریں اور اس باب کا لکھنا اس وقت پر ملتوی کر دیں جب کہ کافی

معلومات بہم پہنچ جائے گی۔ سر دست یہ علم بھی کچھ کم اطمینان بخش نہیں ہے کہ دریائے سندھ و ہرات کے درمیان ابھی تک ایسے آثار سلامت ہیں جن سے مغرب و شرق کے طرز و عمارت میں تعلق و اتصال قائم کیا جاسکتا ہے۔ بعض سیاحوں نے سرسری طور پر ان کی کیفیت قلم بند کی ہے لیکن یہ ہمارے مقاصد کے لئے پوری نہیں ہے اور ملک کی نامتوس حالت دیکھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ غالباً ان کی تفصیلی کیفیت لکھی جانے میں ابھی ایک سرنوعہ درکار ہو گا۔

# باب سوم

## (ترک و) پٹھان بادشاہ

پُرانی دہلی کی مسجد قطب مینار - علاء الدین کا مقبرہ - پٹھان  
بادشاہوں کے مقبرے - ان کی تزئین :-

### سنین

۹۳ھ	شہاب الدین غوری
۱۲۰۶ھ	قطب الدین ایبک
۱۲۱۰ھ	شمس الدین التمش
۱۲۹۶ھ	علاء الدین خلجی
۱۳۲۰ھ	ناصر الدین حسنہ
۱۳۲۱ھ	تغلق شاہ اول
۱۴۱۴ھ	خضر خاں (زیر سیادت امیر تیمور گورگشاہ)
۱۴۵۱ھ	بہلول لودھی
۱۵۲۰ھ	شیر شاہ سوری
۱۵۵۵ھ	سکندر شاہ سوری

غوریوں میں ایک نوخیز نسل کی قوت و ہمت موجود تھی جب کہ انہوں نے  
ہندوستان کی فتح کا کام از سر نو ہاتھ میں لیا۔ ۱۳۹۹ھ میں ایک بار فحش کھا کے سلطان  
شہاب الدین دوبارہ ۱۳۹۹ھ میں ہندوستان آیا اور آجپور کے پرتھوی راج کو شکست دی۔

اس فتح کے بعد ۱۹۱۱ء میں قنوج مسخ ہوا اور شمالی ہندوستان کی ان سب سے بڑی سلطنتوں کی راج دھانیوں کو مسخ کر لینے کے معنی یہ تھے کہ یہ سارا علاقہ سلطان شہاب الدین کی شہادت سے قبل جو مسلمانوں میں واقع ہوئی، اس بادشاہ کے زیر نگیں آگیا تھا۔ لیکن اس کے بعد غوروں کی وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور ملک ہندوستان قطب الدین ایبک کے حصے میں آیا۔ یہ بادشاہ اصل میں ایک ترک غلام تھا جو ترقی کر کے شہاب الدین کا ایک پہلا سالار ہو گیا اور اپنی لیاقت اور جنگی ذہنیت سے اپنے آقا کی ہندوستانی فتوحات میں اس کا شریک و معاون رہا کیونکہ ۱۱۹۱ء میں شہاب الدین اسی کو اپنا نائب بنا لیا تھا۔

جدید فتوحات کا کام جو اس شان سے شروع ہوا تھا، قطب الدین کے جانشین اہمیش نے اولوالعزمی کے ساتھ جاری رکھا اور اس کے انتقال ۱۱۹۳ء سے پہلے شمالی ہندوستان کی حکومت مستقل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ سے نکل کے مسلمان فاتحین کے قبضے میں آگئی۔

ان فتوحات کے بعد ڈیڑھ صدی تک ترک سلاطین کے ماتحت انجینئرنگ تاریخوں میں عموماً پٹھان کے نام سے یاد کرتے ہیں، متحدہ ہی ان بادشاہوں نے مسلسل جیسی مسعدی اور قوت کا ثبوت دیا، وہ ایشیا میں بہت غیر معمولی چیز ہے۔ انہوں نے سلطنت کو قائم اور مستحکم کیا بلکہ اہل ہند پر پیہم فتوحات سے اسلامی سلطنت کی حدود میں اضافہ کرتے رہے اور اس عہد میں اس وسیع سلطنت کا پائے تخت عملاً دہلی ہی رہا۔ لیکن چودھویں صدی کے آخری نصف میں انتشار و انحطاط کی علامتیں نظر آنے لگیں اور یکے بعد دیگرے صوبے کے والی سرکشی کا علم بند کرنے لگے۔ انیس کامیابی ہوئی اور ان کی جدا گانہ مستقل سلطنتیں قائم ہوئیں جن کی قوت و اقتدار اپنی قدیم اور پہلی حکومت سے اور پائے تخت خود دار سلطنت دہلی سے ہمسری کا دعویٰ کرتے تھے۔ بایں ہمہ ان ہم اصل حکومتوں کا سرگروہ رسمی طور پر شہر دہلی ہی رہا تا آنکہ تیمور کی چھٹی پشت میں، بابر بادشاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا (۱۵۱۹ء) اور چٹھانوں کا خاتمہ کر کے آخراً سلطنت متلیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس شہر آفاق خاندان نے پشت میں تمام ممالک کی واحد اسلامی سلطنت کی صورت میں شیرازہ بندی کی یہ ۱۶۰۰ء بادشاہ (۱۵۱۹ء تا

مسئلہ ۱) تقریباً دو صدی کی غیر معمولی مدت تک فرارزوائی کرتے رہے اور ان کے عہد میں سلطنت نے وہ شوکت و اقتدار حاصل کیا جو ممالک مشرق میں قریب قریب بے مثال تھا۔  
 ترک سلاطین کی تعمیری تاج کا آغاز جس طرح شان و شوکت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، اسی طرح ان کی قومی خصائص کا بھی بہترین مرقع ہے۔ جو جتنی انھیں اپنی فتوحات کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا، اسی وقت انہوں نے اپنے دو صدر مقاموں یعنی اجمیر و دہلی میں دو وسیع مسجدوں کی بنادوائی جن کی عظمت و شان سے ان کے دین کا جاہ و جلال ظاہر ہوا اور وہ بت پرستوں پر ان کے غلبہ و ظفر مندی کا نشان ہوں۔ یہ لوگ سب سپاہی پیشہ اور صرف ملک بچھ کرنے آئے تھے اور ظاہر ہے کہ اپنے ہمراہ مصالح اور مہار نہیں لائے تھے لیکن تاتاری نسل کی دوسری قوموں کی مثل تعمیر کا فطری اور قومی شوق موجود تھا اور چونکہ اپنا طرز خاص بھی رکھتے تھے، لہذا یہ قرینہ نہ تھا کہ وہ جو عمارت بنانی چاہیں گے اس میں خطا کھائیں گے۔ دوسرے انھیں اپنی نئی رعایا میں بے شمار کاریگر ایسے مل گئے جو کہہ کے مطابق ہر قسم کے نقشے پر عمارت بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے یا

سب سے اوّل تو ان بادشاہوں کو جیتی مندروں کے دالان دار معنوں میں ایک نئی بنائی مسجد کا قریب قریب پورا لازمہ مل گیا اور صرف اتنی اصلاح کی ضرورت رہ گئی کہ بیچ کا بت خانہ ہٹا کر مغرب کی جانب دیوار اٹھا دی جائے اور اس میں محراب بنادی جائے کہ حسب احکام قرآنی، مسلمان قبلہ رو ہو کر نماز ادا کر سکیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے کبھی ہندوستان میں اتنی سی ترمیم پر اکتفا نہیں کیا۔ اور جن دو مسجدوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں، کم سے کم، ان میں تو بانیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پرانے ستون کے سامنے ایک اور سلسلہ کمانوں کا تیار کیا جائے جس کی زینت اور گنبدہ کاری میں ہندوستانی صنعت کا پورا کمال صرف کر دیا جائے۔ اور حق یہ ہے کہ اس میں انھیں بڑی کامیابی ہوئی۔ اسلامی کمانوں کے صاف اور سادہ خط سے جو عظمت و جلال برتا ہے اس نے مندر کے چھوٹے چھوٹے حصوں کو ماند کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ انگوٹش و انگار کی اتنی کثرت ہے کہ کسی دوسرے نمونے میں جہاں تک

علم ہو سکا اسے نقش و نگار نہیں ہیں، تاہم انھیں اتنا چٹا رکھا ہے کہ تعمیر کے صاف خطوط میں کہیں غلط یا انقطاع واقع نہیں ہوتا۔ باہر کے رخ تو ممکن ہے کہ اتنا تفصیلی کام دوسری جگہ بھی ہو لیکن شکل سے اس پیمانے پر کیا گیا ہو گا۔ مسجد یا صوفیہ مقبول کے بعض اندرونی حصوں میں اسی قدر خوشنما کام کیا ہے بلکہ لیکن وہ صرف چند مربع گز میں ہے۔ قصر مانشا اگر مکمل ہو جاتا تو اس کی جھوکا ہوتا لیکن وہ محض ایک نام حصہ ہے اور گو خضر و پرویز اور بارون الرشید کے عہد کے مابین ایران میں بے شک ایسی عمارتیں ہونگی جو اس کے ہم پلہ ہوں، مگر وہ منہدم ہو چکیں یا کم سے کم ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ دوسرے طرز عمارت کے لحاظ سے وہ ان ہندوستانی مسجدوں جیسی نہ ہو سکتی تھیں۔ ان میں فن کی بعض بہترین اصناف سے عجیب و غریب طریق پر کام لیا ہے جیسا کہ پہلے ہندو صنائع کیا کرتے تھے اور بعد میں مسلمان فنانچوں نے ان کو استعمال کیا۔

## دہلی

پرانہ دہلی اور اجمیر کی مذکورہ بالا دو مسجدوں میں دہلی والی مقدم ہے کہ اجمیر کی مسجد سے سات اٹھ سال قبل اس کی تعمیر شروع ہوئی اور وسعت میں بھی پہلی ہی زیادہ بڑی ہے بلکہ دوسرے اس کا قطب تینار اور اس عہد کے بعض خوبصورت ترین مقبروں سے تعلق ہے اور یہ سب مل کر ایسا مجموعہ بناتے ہیں کہ اجمیر میں

۱۔ ”ہٹھری۔۔۔ آرکی کلچر“، اول، ۴۴۰، دہلی

۲۔ ایضاً

۳۔ ۴۰۱

۴۔ جنرل کنگن جیمز کی ”آرکیولوجیکل رپورٹس“ جلد دوم، ۲۶۰ کو مسجد قوت الاسلام دہلی کا اندرونی حصہ ہی پہلے مسجد کا کل رقبہ تھا لیکن ان دونوں کے مصلیٰ بانی سلطان شمس الدین لکھنؤ کی زندگی ہی میں دہلی کے دالانوں کو اجمیر کے دو بونیٹ طویل دالانوں کی نسبت بڑھا کر ۲۸ فٹ کر دیا گیا تھا دونوں مسجدوں کا صحن پھر بھی یکساں، البتہ کل رقبہ اجمیر میں ۲۷ ہزار اور دہلی میں ایک لاکھ ۵۱ ہزار فٹ ہو گیا۔



اس کے مقابلے کی کوئی چیز موجود نہیں۔ فرید پراں دہلی کے کھنڈروں کو محل وقوع ایسا خوشنما ملا ہے کہ نظیر نہیں رکھتا کیونکہ یہ پہ پہاڑی کے ایک خفیف سے تدریجی ڈھلان پر واقع ہیں جس کے نیچے ایک میدان پھیلا ہوا ہے جو بظاہر کسی زمانے میں جھیل ہو گا لیکن بعد میں ایشیا کے تین دارالسلطنتوں کا مقام بنا۔ سامنے کے رخ تغلق آباد یعنی ایک قدیم پٹھان سردار کا شکستہ قلعہ واقع ہے اور اس سے بھی آگے شمال کی طرف آخری پٹھان اور پہلے مثل بادشاہوں کے پائے تخت یعنی فیروز آباد اور اندر پت کے کھنڈر دور تک چلے گئے ہیں۔ اس کے پار قدیم دہلی سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر نئے پائے تخت شاہجہاں آباد کے بروج و مینار نظر آتے ہیں جہاں ۱۹۹ شہسلاہ تک منلوں کی برائے نام بادشاہی کا ستقر تھا۔ اور آگے شمال میں بڑھیں تو انگریز عہدہ داروں کا محلہ اور قدیم انگریزی چھاؤنیوں کے شکستہ آثار ہیں۔ خوش قسمتی سے یہاں انگریز عہدہ داروں نے پرانے کھنڈروں میں سکونت اختیار نہیں کی جس طرح اگر سے نہیں ہوا اور نہ دہلی کے آثار قدیمہ بھی سلامت نہ رہے اور بلاشبہ ان کے سنگ مر کے ستون تو ضرور اڑائے جاتے اور انھیں بلا لحاظ موزونیت کے جہاں ضرورت ہوتی ہا لگا دیا جاتا اور ان قدیم آثار کے قیام و بقا کی مطلق پروا نہ کی جاتی۔ کھنڈروں سے انگریزوں کے دور رہنے اور ان کے کچ جانے کے باوجود بھی مشہور و معروف شاہنشاہی باغ کی اہلیہ کہ انگریزی محلے کے قریب ہی قدیم عمارات کچھ خصوصیت اور وقعت رکھتی تھیں، مدت ہوئی کہ بے نشان ہو گئی ہیں۔

خاص خاص کھنڈروں کا محل وقوع ذیل کے خاکے سے سمجھ میں آسکے گا جو نہایت اقیانوس سے تیار کیا گیا ہے اگرچہ اس کا پیمانہ آنا چھوٹا رکھنا پڑا کہ اس کی تمام خصوصیات نمایاں نہیں ہو سکتیں۔ بہر حال اصل خاکہ پیش کرنے سے قبل بڑی بڑی عمارتوں کا موقع مختصر طور پر بیان کر دینا مناسب ہے :- مغرب کی جانب خاکے میں

۱۔ نئی دہلی کی عمارتیں تھیں اور شاہجہاں آباد کے درمیان اسی رقبے میں بن رہی ہیں جس کے مختلار بننے پر مصنف اس قدر غشی کا اظہار کرتا ہے لیکن غنیمت ہے کہ آج کل آثار قدیمہ کے ساتھ ایسی بیداری و آہنیں رکھی جاتی ہیں کہ مصنف نے جاہ جبار و زار دیا ہے نہ تدریج

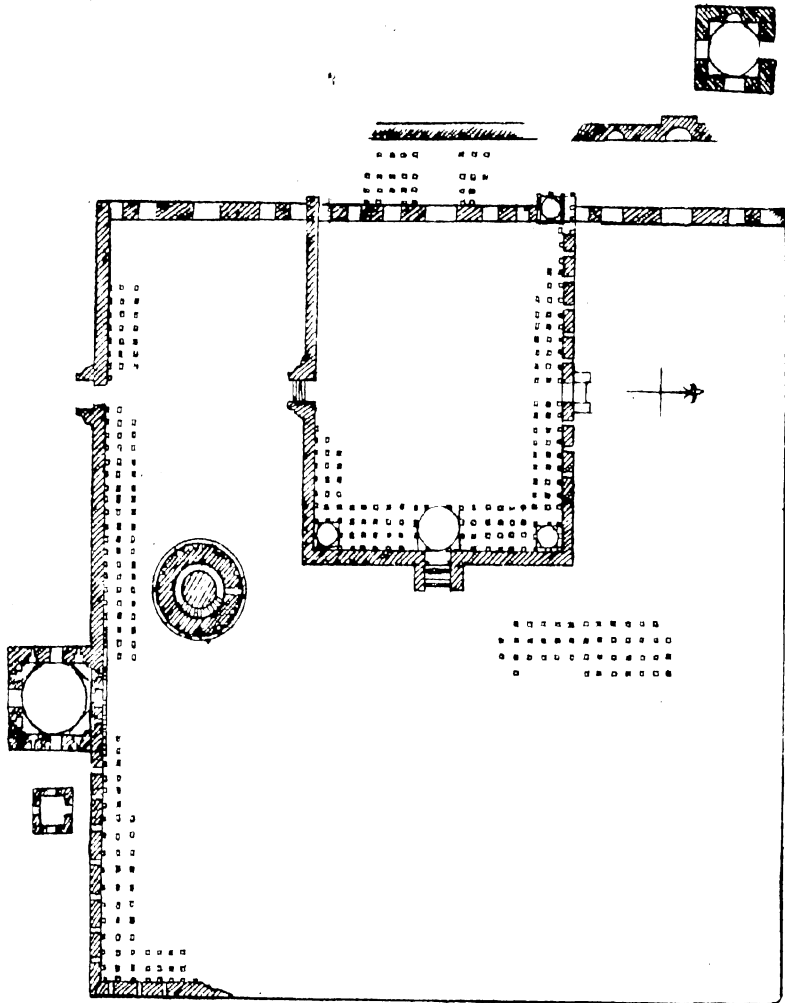
اندراجھن دکھایا ہے وہ قطب الدین کی اصلی اور پہلی مسجد ہے جس کا رقبہ، والان چھوڑ کر،  $۱۴۲ \times ۱۰۸$  فیٹ ہے اور اس کے مغربی پہلو کے وسط میں لوہے کی لٹھ استادہ ہے۔ بڑا دروازہ ایک گنبد کے نیچے ہے جس کا قطر جانب مشرق ۲۰ فیٹ کے قریب ہے اور اس کے برابر ستونوں کی چوہری قطار دے کے مسقف بنایا ہے آخری قطار عقبی دیوار سے ملی ہوئی چلی جاتی ہے شمال اور جنوب کے کمرے پر و منزلہ بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں پہلو کے ستونوں میں ستونوں کی تین قطاریں دی ہیں اور سروں پر خالی راستہ چھوڑ دیا ہے اگرچہ اس مسقف کا مغربی حصہ اور بڑا دروازہ اب ٹوٹ پھوٹ کے غائب ہو چکا ہے۔ مشرقی نصف کی بھی صرف ۲۰ گز کے قریب دیوار اور والان کا ایک حصہ سلامت ہے۔ جس کے ستون دوسرے پہلوؤں کی نسبت بہت سادہ ہیں۔ محراب کے مغربی سرے پر حجابی دیوار، لٹھ فیٹ آثار کی ہے جس میں عظیم الشان کمائیں بنائی ہیں اور یہ اصل مسجد کے در ہیں جو ۳۵ فیٹ لمبی اور ۲۲ فیٹ چوڑی تھی مگر اب بالکل منہدم ہو چکی ہے اور سوائے بیس بائیس ستونوں کے جن پر چھت قائم تھی، اور کچھ باقی نہیں رہا۔ صحن مسجد کے جنوب مشرقی گوشے پر قطب مینار بنا ہوا ہے جو اسی مسجد کے ساتھ کی تعمیر ہے۔

سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۲۵ء کے قریب، بڑی دیوار کو شمال و جنوب دونوں طرف ۱۹ فیٹ بڑھا کے پانچ پانچ کمانوں کا اور اضافہ کر دیا تھا جو قطب الدین کی کمانوں سے عرض و ارتفاع میں مختلف ہیں اور نقاشی بھی ان پر دوسری طرح کی

۱۔ کارستیفن آرکیولوجی اوف ڈلہی میں (صفحہ ۴۰، حاشیہ) لکھتا ہے کہ گزشتہ صدی کے اوائل میں مسجر اہمیت، اکرکیٹو انجینیر نے اسی والان اور اس کی عقبی دیوار کو بحیرت انگیز بے احتیاطی کے ساتھ دوبارہ بنایا اور مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے التمش کے توسیع کئے ہوئے حصے کے ستون اس کام کے لئے استعمال کئے۔ اسی کے ساتھ اس ترتیب جدید کے سلسلے میں قطب الدین کے بنائے ہوئے درجے تک کتبہ نہیں رہے دیئے گئے۔

۲۔ صحن مسجد کے مشرقی دروازے کے کتبے میں سنہ ۱۱۹۳ھ (۱۷۹۳ء) درج ہے لیکن شمالی دروازے کے کتبے میں لکھا ہے کہ اس عمارت کا آغاز ۱۱۹۳ھ میں ہوا۔ کننگہم، رپورٹس۔ اول، ۱۸۵ء و ۱۸۶ء

کی گئی ہے۔ اصل میں یہ صدر دہان کے دونوں پہلوؤں پر جو جدید عمارت بنی اسکی روکاریں



تصویر ۳۶۱ - خاکہ آثار قدیمہ دہلی قدیم

ہیں۔ ان میں سے شمالی توسیع کی عقیبتی دیوار اور وسطی اور پہلو کی ایک محراب کی جگہ ابھی تک باقی ہے۔ اسی طرح توسیع کردہ صحن کی جنوبی دیوار مع اپنے سقف کے قائم ہے؛ مگر مشرقی سقف کے صرف چند ستون رہ گئے ہیں جن سے اتنا ضرور معلوم

ہو جاتا ہے کہ جدید صحن اپنے والاؤں سمیت شمالاً جنوباً ۳۷ اور شرقاً غرباً ۲۲ فٹ تھا، اور اس کے اندر قطب مینار بھی اگیا تھا۔ آتمش کا مقبرہ اسی توسیع کردہ مسجد کے شمالی سرے پر درامغری جانب کو تعمیر ہوا ہے۔

اس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے اور زیادہ توسیع کی تجویز کی اور آتمش کے صحن کی مشرقی دیوار کوئی ۵۵ فٹ اور بٹادی کی جنوبی دیوار اور دالان بڑھ کر (شرقاً غرباً) ۲۸۵ فٹ ہو گئے۔ اسی رخ خوشنما علّامی دروازہ تعمیر ہوا جس کے متصل ”امام محمد علی خاصن“ کا چھوٹا سا مقبرہ کوئی ۲۲ فٹ مربع بنا ہوا ہے۔ سنگ مرمر و سرخ کی یہ عمارت ۱۳۳۵ء کے قریب کی تعمیر ہے۔

شمال کی طرف سلطان قدیم صحن کو دگنا کر دینا چاہتا تھا کہ پورا طول (شمالاً جنوباً) ۷۵۰ فٹ ہو جائے اور اسی خیال سے اس شمالی نصف میں اس نے علّامی مینار بنوانا شروع کیا تھا جو پہلے سے عرض و ارتفاع میں دگنا ہو لیکن اس کے اور مجوزہ توسیع کی روکار کے پایوں کے ہوا اور کوئی عمارت غالباً اس شمالی رخ پر نہ بن سکی۔ خود علاء الدین کا مقبرہ جو اب کھنڈر ہو گیا ہے اس احاطے کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔

طرز عمارت کا اندازہ کرنے کی غرض سے یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ سب ستون ہندوانی وضع کے اور سب دیواریں اسلامی طرز کی ہیں۔

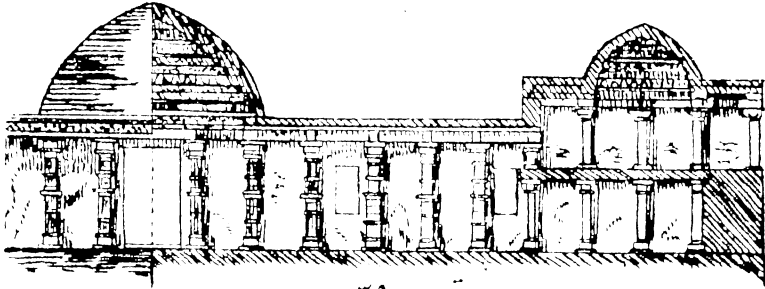
شاید سوال پیدا ہو کہ قدیم مندر کے ستون اب کس حد تک قائم ہیں لیکن یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو مسلمان فاتحوں نے اپنی جگہ سے بدل دیا تھا اور یہ بھی بدیہی بات ہے کہ احاطے کی دیواریں مسلمانوں نے ہی تعمیر کیں کیونکہ بندھنوں پر ہر جگہ خاص ان کے طرز میں نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اور تمام دروں میں نوک دار محرابیں ہیں جو ہندوؤں نے کبھی نہیں بنائیں۔ غرض مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ساری عمارت اس شکل میں مسلمانوں ہی کی بنائی ہوئی ہے جس میں اب ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قنونج کی مشہور مسجد بھی اصل میں ہندو یا جینی مندر تھی جس کو مسلمانوں نے بالکل قدیم قاترہ کی مسجد عمرو کے نقشے پر از سر نو مرتب کیا ہے اس کے گنبد اور محبتیں سب جینی طرز کی ہیں۔

اور اندر اسلامی طرز کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی لیکن باہر کے رخ طرز تعمیر خالص اسلامی ہے۔ منڈو کے قریب دتھار میں بھی ایک مسجد قریب زمانے کی تعمیر ہے اور کچھ شاک نہیں کہ اسے کسی قدیم ہندو یا جینی مندر کو از سر نو ترتیب دے کے بنایا، اسی طرح جوتپور اور احمد آباد وغیرہ مقامات پر ایسی مسجدیں موجود ہیں جن میں پہلے مصلح کو لے کر نئے سرے سے ترتیب دے دیا ہے۔ اب اگر قطب کی مسجد میں پہلے ستون قدیم جگہ پر رہنے دیئے گئے ہیں تو یہ ایک استثنائی صورت ہوگی بلکہ اس کا قرینہ نہ ہونے کے باوجود، میں یہ گمان کئے بغیر نہ رہ سکا کہ گوشوں کی دو منزلہ اور جہابی دیوار کے عقب کی بارہ دریاں، ممکن ہے اپنی قدیم جگہ پر چھوڑ دی گئی ہوں لیکن اس مسئلے پر ہم دوبارہ انجیم کی مسجد کے سلسلے میں (جہاں غالباً تمام ہندو ستون اپنی پرانی جگہ سے ہٹا کے از سر نو نصب کئے گئے ہیں) گفتگو کریں گے نہ بہر حال، اتنی بات ضرور یقینی ہے کہ قطب کی مسجد میں بعض ستون غیر مصالحے کے ہیں اور یہ کہ مسجد بنانے والوں نے انھیں جہاں نصب کیا تھا، اب تک وہ اسی جگہ قائم ہیں۔ اس مقام پر یہ تصریح غالباً ضروری ہے کہ ان عمارتوں کو اپنی پرانی جگہ سے ہٹانے اور دوسری جگہ بنانے میں کچھ دشواری پیش نہیں آ سکتی۔ کیونکہ ستونوں کے جوڑ ایسی محنت کے ساتھ بٹھائے ہیں کہ ہندوؤں کا بصیرت و استقلال ہی اس کام کو انجام دے سکتا تھا۔ پھر حیثیت کا ہر ٹکڑا نو نو سلوں سے بنایا ہے جس میں چار مستطیل نما، چار زاویہ دار اور ایک وسطی تختی ہے (جیسا کہ پہلی جلد کی شکل نمبر ۱ میں ہم بیان کر آئے ہیں) اور یہ سب بغیر گچ یا مصالحے کے اس طرح جمائی ہیں کہ آسانی سے نکال کر دوسری جگہ جمائی جاسکتی ہے۔ برجیوں کا بھی

۱۰ جنرل کننگہم کو دیوار پر ایک کتبہ لاجس میں تحریر تھا کہ اس ایک مسجد کے واسطے ہندوؤں کے ستائیس مندر ہندم کئے گئے؛ (ریپورٹس۔ اول۔ ۱۷۶) لیکن جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ جو مندر توڑے گئے وہ کس قسم کے تھے، اس وقت اتنی بات سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ مثلاً گھنٹے کو چھوڑ کر کعبہ راہو کے ستائیس مندر بھی کافی نہیں ہو سکتے کہ اس مسجد کے آدھے ستون بھی ہم پہنچا دیں۔ بخلاف اس کے سادہی کے قریب قریب ایک ہی مندر پوری مسجد کے لئے قریب قریب کافی سامان فراہم کر سکتا ہے اور گو یہ مندر قریب زمانے کا بنا ہوا ہے لیکن یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ایسے مندر موجود نہ تھے؛

حال یہی ہے اور ان کے جوڑا ایسے صحیح اور الگ الگ ہیں کہ ہٹانے اور دوبارہ عمارت بنانے میں کوئی وقت یا خرابی نہیں ہو سکتی ہو

بڑے دالان کے نصف حصے کی تصویر ذیل سے اس کی صورت کا جنوبی اندازہ ہو سکے گا یہ دالان



تصویر ۲۹۔

بڑی کمانوں کے مقابل بنا ہوا ہے اور ترتیب کے لحاظ سے اس قدر خالص معینی ہے کہ شاید ہم کو معینی طرز عمارت کے ذکر میں اس کا بھی حوالہ دینا چاہئے تھا لیکن ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد میں ہونے کے باعث زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس جگہ اس کا ذکر آئے۔ دالان کسے ستون اسی درجے کے ہیں جیسے کوہ آبو کسے مندر میں استعمال کئے گئے ہیں لیکن ان دہلی والوں پر بہت زیادہ اور باریک نقوش ہیں۔ ان میں سے اکثر غالباً عیار ہوں، بارہویں صدی عیسوی کے ہیں اور ہندوستان کے ان چند نمونوں میں جن پر حد سے زیادہ نقش و نگار نے ہوئے ہیں ان کا بھی شمار ہے۔ گرد نے سے لے کے بنیاد تک ایک اچھ بھی جگہ نقوش سے خالی نہیں ہے سوائے ان ستونوں کے جو حجابی دیوار کے عقب میں ہیں یا چند اور کے، جو ممکن ہے زیادہ پرانی عمارتوں سے لائے گئے ہوں۔ بایں ہم نقش و نگار کو ایسی صفائی اور چابکدستی سے تراشا ہے، اور اس شکستگی و کھنکی کے باوجود وہ ایسے قابل دید اور خوشنا ہیں کہ ان کی عیب جوئی کرنا سخت گراں گزرتا ہے بعض صورتوں میں وہ تصویریں اڑا دی گئی ہیں جو وسط ستون میں کندہ تھیں، اور مسلمانوں کو تصاویر کے بارے میں جو تشدد

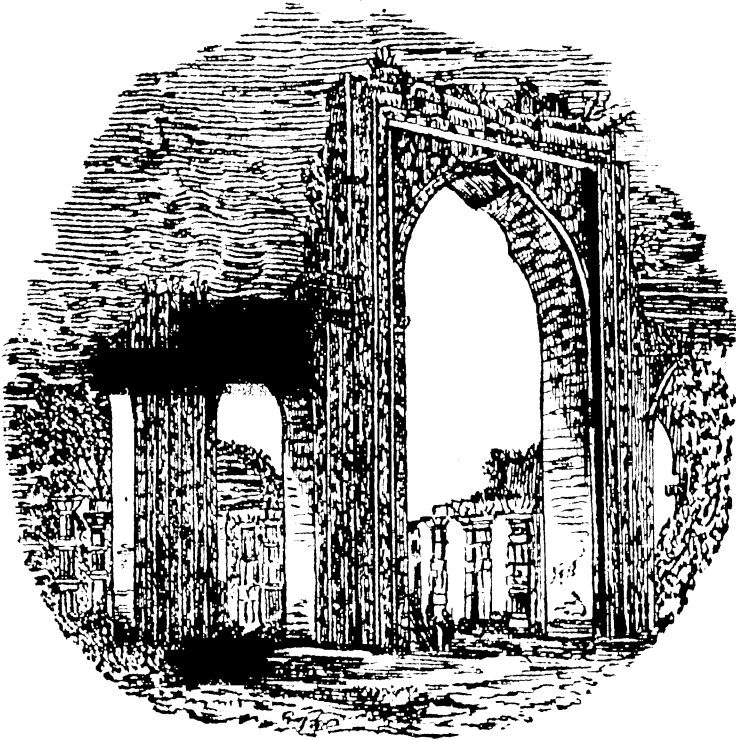
ہے اس سے آشتی نہ رکھتی تھیں لیکن چھت اور دوسرے اگک ٹپے ہوئے حصوں میں تصنی  
مینوں کی چار زانو تصاویر اور اس مذہب کے دوسرے نشانات کندہ کئے ہوئے  
ابھی تک دکھائی دے جاتے ہیں۔

۲۰۳۔ لیکن مسجد کی شان و خوبی ان ہندوانی آثار سے نہیں ہے بلکہ مغرب کی  
طرف محرابوں کے وسیع سلسلے سے ہے جو ۲۸۵ فٹ تک شمالاً جنوباً چلی گئی ہیں۔  
اور جن میں تین بڑی اور آٹھ چھوٹی کمانیں ہیں۔ وسطی ۲۲ فٹ چوڑی اور ۵۲ فٹ اونچی  
ہے۔ پہلو کی بڑی کمانوں کا عرض ۲۲ فٹ اور بلندی ۱۷ فٹ کی کمان کے قریب ہے۔  
چھوٹی کمانوں کا عرض دار تفلع نصف کے قریب ہے اور افسوس ہے کہ یہ بہت شکستہ  
ہو چکی ہیں۔ (ملاحظہ ہو آئندہ تصویر) بیان کرتے ہیں کہ اس سلسلے کا وسطی حصہ جو طول  
میں ۷۴ فٹ ہے قطب الدین ایبک نے غزنی سے واپس آکر تعمیر کیا تھا اس کے  
عقب میں ۲۲ فٹ کے فاصلے سے مسجد کی پشت کی دیوار کے آثار ہیں جس کا ارتفاع  
شاید اسی قدر رکھنا منظور تھا کہ ان ہندو ستونوں کی چھت تک پہنچ جائے جو اس  
دیوار کے اندر آگئے ہیں۔ قرینہ کہتا ہے کہ ۱۱۹۷ء میں صرف ان ہندو ستونوں پر  
چھت ڈالنے کی تجویز تھی جو ان دو حجابی دیواروں کے درمیان ہیں کیونکہ ان میں سے  
بعض بڑی کمانوں کے عقبی حصے میں بنے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر کا سرا بالکل صاف  
اور چمکا ہے اور ان کے اوپر کسی قسم کی چھت یا دلو ڈالنے کا ارادہ نہیں پایا جاتا حقیقت  
میں مسجد کے لئے چھت کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ صرف ایک دیوار قبلہ رو درکار  
ہوتی ہے اور ہندوستان میں اکثر مسجدیں ایسی ہی بنائی گئی ہیں اگرچہ نماز میں غفل  
نہ پڑنے کے خیال سے اکثر احاطہ کھینچ دیا جاتا ہے بلکہ مسقف دالان ظاہر ہے کہ سہو  
اور خوشامی کے لئے بنا دیئے جاتے ہیں ورنہ یہ ناگزیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اس مسجد کی تعمیر ہی اس کی جو تاریخ سناتی ہے وہ کچھ کم قابلِ تعجب نہیں ہے۔  
معلوم ہوتا ہے افغان فاتح اس بات کا تو خاص واضح تصور رکھتے تھے کہ نوکدار

۱۔ مصنف کا مطلب عید گاہوں سے ہوگا، ورنہ پختہ مسجدیں بنیر مسقف کے کہیں نہیں بنائی جاتیں۔  
مترجم۔

محرابیں عمارت کے درون کی سب سے صحیح صحت ہیں لیکن اس صورت کو تیار کرنے کا طریقہ انھوں نے ہندو راج معماروں پر چھوڑ دیا جنھیں اس کام کے واسطے رکھا تھا۔ ہندوؤں نے اس وقت تک محرابیں کبھی نہ بنائی تھیں اور نہ آئندہ صدیوں بعد تک بنائیں۔ لہذا انھوں نے نوکدار کمانوں کو اسی اصول پر تعمیر کیا جس پر اپنے ہاں کے گنبد بنایا کرتے تھے یعنی جہاں تک سیدھا چلے جاسکتے تھے وہاں تک سیدھا چلے گئے اور پھر بڑی بڑی تل کی مٹیاں رکھ کر انھیں سرے پر لاد دیا اور یہ وہ طرز ہے جو شمس کو ملے کی بدر روگی کمان میں استعمال کیا گیا ہے۔ کمانوں کے سامنے کے رخ نقش و نگار بنانے کی خدمت بھی انھی معماروں کے سپرد ہوئی اور انھوں نے اس طرح انجام دی کہ مقابل میں صحن کے دوسری طرف جو عمارتیں اور ستونوں کے نقش بنے ہوئے تھے انھیں کی نقل و تکرار سے پوری کمان کو نہایت باریک



۲۰۴

لمۃ افغان فاتح" سے یہاں ابتدائی ترک لاطین مراد ہیں مصنف کا یہ نعرہ وضع بھی کہ مسلمان فاتح اپنے ساتھ راج سہا نہیں لائے تھے مسیح نہیں اور قدیم تاریخوں سے اس کے خلاف شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں (۱) ترجمہ نمبر (۸) برصغیر دیگر



۲۰۵

اور نازک قیمتوں کی کدہ کاری سے معمور کر دیا کہ سوائے اجمیر کی مسجد کے اور کہیں ایسا کام نہ پہلے بنا تھا نہ بعد میں بنایا گیا اور گو اس زمانے پر نقاشی کرنا بڑی حد تک اسے ضائع کرنے کے مرادف ہے تاہم اس قسم کی صنّاعی میں اس کی نظیر بلا استثنا کہیں نہیں ملتی۔ چونکہ یہ پتھر خاص طور پر سخت اور عمدہ تھا، اس کے نقوش کی تیارگی آج باقی رہی۔ البتہ کمائوں کے اوپر کے نقوش خراب ہو گئے۔ جہاں ہندوؤں کی ناقص تعمیر نے اسے وقت سے پہلے لگاڑنے کا سامان بہم پہنچا دیا تھا۔

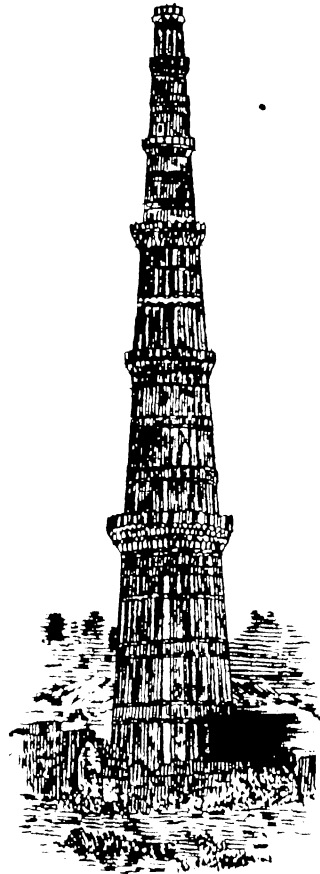
قطب مینار، یا پہلی مسجد کے جنوب مشرقی گوشے کا مینار، نیچے ۴۴ فٹ اونچا قطر میں ہے اور ۹۸ فٹ میں ناپا گیا تو بلند سی ۲۴۲ فٹ تھی۔ اس وقت بھی اس کی چھتری ٹوٹ چکی تھی لہذا دس یا بیس فٹ اور جمع کرنے چاہئیں کہ اس کے اصلی ارتفاع کا صحیح اندازہ ہو۔ مینار میں چار خوب آگے بڑھے ہوئے چھبے یا جھروکے ہیں۔ پہلا، ۹ فٹ دوسرا ۱۴ فٹ، تیسرا ۱۸ فٹ اور چوتھا زمین سے ۲۱۴ فٹ کی بلند سی پر ہے اور ان کے درمیان ابھری ہوئی میلوں پر بہت گنجان سنگائے اٹھی کی ہے اور کتبات کدہ ہیں نیچے کے درجے کے چوبیس بل (یا نیچے) گولائی کو

بقیہ ماثیہ مٹو گزشتہ۔ ۱۷۵۰ء کے سہ ماہیہ سہری... اور کی بکھر "بلداؤل (ص ۲۰۱) میں صراحت کی گئی ہے، طبعی تعمیر صرف اس وقت مناسب ہوتا ہے جب کہ ان میلوں سے جیسی یہاں لگائی گئی ہیں زیادہ بڑے پتھر استعمال کئے جائیں نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں نے اس کمان کو دیکھا اور نقشہ لیا تو وہ بہت شکستہ حالت میں تھی۔ حکومت نے بعد میں اسے اعتیاد سے دوبارہ قائم کرا دیا ہے لیکن پہلو کی دو کمائیں تو مکمل ہی نہ ہوئیں تھیں اور یا اسی فاسد طرز تعمیر کے باعث گر پڑیں۔

۱۷۵۰ء میں ایک رسرخرچہ پنجم ۲۱۳۔ جنرل کننگہم کے بقول (اور پر کی جدید چھتری کو چھوڑ کر) اس کی بلند ۲۲۸ فٹ ایک اونچ ہے۔ رپورٹس اول ۱۹۶۔

۱۷۵۰ء پہلے درجے میں کتبات کی چھ میاں ہیں۔ نیچے کی پٹی پر قطب الدین ایک کے نام والے القاب دوسری سلطان محمد ابن سام کے القاب و ادھاف تیسری پر قرآن شریف کی ایک آیت اسی طرح پانچویں میٹھی پر ایک آیت اور پانچویں سلطان محمد ابن سام کی توصیف کندہ ہے۔ اذان دوسرے درجے پر چڑھادی جاتی تھی۔ دیکھو اور کیونجی ادھاف دہلی صفحہ ۵ وغیرہ۔

پورا کرتے ہیں جن میں ایک کمر کی اور دوسرا درجہ ہے۔ دوسرے درجے میں سب دور اور تیسرے میں سب کمر کی ہیں اور باقی حصہ مینار کا سپاٹ اور مشیر سنگ مرمر کا ہے جس کے بیچ میں اسی سنگ سرخ کی پٹیاں جس سے نیچے کے تین درجے بنائے ہیں آجاتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو تصویر)



تصویر قطب مینار

یہ بیٹھیک معلوم نہیں کہ یہ کمر کی بل (یا ابھری ہوئی پٹیاں) خراسان یا آگے کے مغربی ممالک کے میناروں سے نقل کئے گئے ہیں یا عینوں کے مندروں کی وضع دیکھ کر انھیں ایجاد کیا ہے۔ غرانی کے میناروں کی بنیادیں دیکھ کر تو پہلے قیاس کی تائید ہوتی ہے لیکن میٹور وغیرہ علاقوں کے بہت سے اور خصوصاً چینی مندروں کی ستارہ کا شکل یہ خیال دلاتی ہے کہ ممکن ہے اس وضع کا ماخذ ہندووانی ہو لیکن شمالی ہند میں اب تک اس طرز کی عمارت نہیں ملی اور نہ کرشتیہ ہندام و شکستگی کے باعث آئندہ ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔ بہر نوع مجموعی طور پر یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہو گا کہ قطب مینار اس طرز کی عمارتوں میں سب سے خوبصورت ہے۔ اکثر حضرات کو فوزا فلورینس کی لاٹھ کا خیال آئے گا جو گیتوٹو نے بنائی اور قطب مینار کی حریف ہو سکتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ ۳۰ فٹ زیادہ اونچی ہے لیکن اول تو برابر میں گر جا کے ڈھسٹوئے اس کا خن خاک میں ملا دیا دوسرے

خوشنمائی کے باوجود اس کے نقشے میں وہ تازک خیالی اور نقش و نگار میں وہ کمال صنایع کہاں جو قطب مینار کے ایک ایک بل میں نظر آتی ہے اس کے پہلوؤں کا زادیہ ذرا اونچا رہتا تو غالباً خوشنمائی بڑھ جاتی مگر یہ بات صرف دور کے دیکھنے سے ذہن میں

گزرتی ہے۔ ورنہ صحن مسجد سے کھڑے ہو کر دیکھئے تو اس کی ساخت کمال ہے اور اپنے اطالوی حریف کی چو کور چار خانہ دار بناوٹ سے بہر صورت بہتر ہے۔  
قطب مینار سے جہاں تک معلوم ہے مسلمانوں کی بنائی ہوئی صرف ایک عمارت بلندی میں زیادہ ہے یعنی قاہرہ کی مسجد حسن کا مینار بلکہ لیکن پرانی دہلی کا یہ مینار ایک مستقل اور بائٹل عدا گاہ عمارت کا مرتبہ رکھتا ہے اور صورت ظاہری میں کہیں زیادہ خوشنما اور بہ اعتبار اپنی تکمیل و ساخت کے نہ صرف اس مصری حریف سے کہیں بہتر بلکہ جہاں تک یہ اعظم ہے دنیا بھر میں اس قسم کی عمارات میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ واضح رہے کہ قطب مینار صرف اس غرض سے نہیں بنایا گیا تھا جس غرض سے مسجدوں کے ساتھ مینار یا ماذن عموماً تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اور گو اس کے پہلے درجے پر چونکر اذان دی جاتی تھی اور غالباً ایک مقصد اس کی تعمیر کا یہی ہو گا، تاہم دراصل یہ ایک فتح کی یادگار اور مسلمانوں کے غلبے کا نشان تھا جسے ہندو بخوبی سمجھ سکتے تھے۔

اس مینار کے ۵۴ فٹ شمال میں علاء الدین خلجی نے ایک دوسرا مینار ۱۳۱۵ء میں بنوانا شروع کیا جس کا محیط ۲۵۴ فٹ اور پہلے سے دوگنا تھا۔ لیکن کرسی کے اوپر یہ صرف ۵۵ فٹ اونچا بن سکا اور پھر ناتمام چھوڑ دیا گیا جس کی وجہ بظاہر یہی تھی کہ بانی کا ۱۳۱۵ء میں انتقال ہو گیا۔  
ان سب عمارتوں کا سنہ بنا کافی صحت کے ساتھ ان کتبات سے معلوم ہوتا ہے جو ان پر کندہ ہیں۔

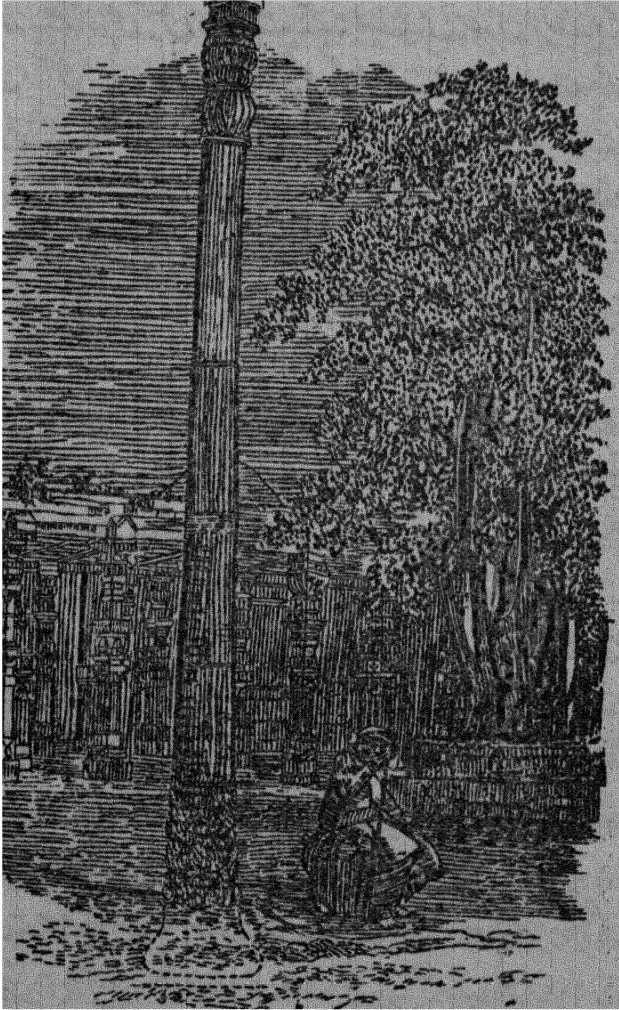
۱۳۱۵ ہجری۔۔۔ ارکی پھر ۵۲۲ھ۔

۱۳۱۵ء ایک قیاس یہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ مینار خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا جو مسلمانوں میں ایک مشہور ولی گزرے ہیں اور ۱۳۱۵ء میں وصال پائی ہوئے (دیکھو رادرفی کے حاشی طبعات ناصری صفحہ ۶۲۱) خواجہ صاحب کی درگاہ مینار سے کوئی تین فرلانگ جنوب مغرب میں واقع ہے۔

۱۳۱۵ء ترجمہ و التذویر، ایشیاٹک ریسرچ، چارٹرم، ۴۸۰۔ نیز کننگھم، رپورٹس اول، ۱۲۲ء و ایلہا۔

اور انہی سے پیدہ ظاہر ہوتا ہے کہ اندرونی صحن کی چار دیواری سلطان شہاب الدین محمد بن سام نے بنوائی تھی۔ سطلی کمانوں کا سلسلہ قطب الدین ایبک نے اور ہلو کے دالان خمس الدین اشمش نے تعمیر کئے جس کا مقبرہ شمالی سلسلے کے عقب میں ہے اور قطب مینار کو بھی اسی بادشاہ نے بنوایا یا مکمل کیا تھا۔ اس طرح تعمیر کا سلسلہ ۱۲۹۱ء سے ۱۲۹۵ء تک پھیلتا ہے جس کے بعد وہ غالباً اشمش کی وفات کے باعث اسی ناتمام حالت میں ٹیڑھی رہ گئیں۔

۲۰۷



تصویر ۳۷۳۔ لوہے کی لاقہ

اس مسجد سے متعلق ایک نہایت دلچسپی کی چیز وہ لوہے کی لاقہ ہے جو

۲۰۸

اس کے صحن میں استادہ ہے (دیکھو تصویر بالا) زمین کے اوپر اس کی بلندی ۲۲ فٹ ہے اور اب تحقیق ہو گیا ہے کہ زمین کے اندر صرف ۱۰ انچ دبی ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہوا ہے کہ اس لائٹھ کا کل طول ۲۲ فٹ ۸ انچ ہے یعنی اس کا قطر ۱۶،۴ انچ اور اوپر سرے کا ۱۲،۵ انچ ہے۔ سرینار ۱۰ فٹ اونچا ہے اور صاف و تراشیدہ صورت میں ایرانی وضع سے ملتا ہے جس سے لائٹھ اس عہد سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے جس عہد میں فی الواقع تیار ہوئی تھی۔ دوسرے اسی سرے کو شلجمی وضع پر ڈھلا ہے جو کافی قدامت کا پتہ دیتی ہے لیکن یہ ٹھیک ٹھیک ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا کہ اس کا اصلی زمانہ بنا کیا ہے۔ اس پر کتبہ کندہ ہے مگر تاریخ نہیر لکھی۔ برنست نے حروف کی وضع دیکھ کر قیاس کیا تھا کہ یہ تیسری یا چوتھی صدی عیسوی لکھی ہے۔ اور اسی شہادت کی بنا پر بھاؤ داجی نے اسے پانچویں صدی کے اخیر یا چھٹی کے آغاز کی ساخت قیاس کیا۔ تعمیر اپنا عقیدہ

۱۷ اس کی ہاشم بھی ایک عجیب مثال ہے کہ سندوستان میں ہنس اوقات صحیح اطلاع ملنے میں کتنی دشواری پیش آتی ہے چنانچہ جب جنرل کننگھم نے اپنی رپورٹ ۱۸۵۸ء میں شالک میں تو بظاہر دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کوٹر کے بیان پر لکھ دیا کہ لائٹھ کی جڑ ۲۰ فٹ نیچے تک کھودی گئی مگر اس کا سر نہیں ملا۔ مگر جو شخص اس کا پتہ مقرر تھا۔ اس نے کننگھم کو یسٹن والا لیا کہ کھدائی ۲۵ فٹ تک ہوئی تھی (جلد اول ۹۶) جس کی بنا پر کننگھم نے اس کا پورا ۶۰ فٹ تخمینہ کیا مگر خوش قسمتی سے حکم دیا کہ دوبارہ کھدائی کی جائے اور ارادہ کر لیا کہ جڑ تک کھدوائے بغیر نہ ہوں گا۔ اس وقت حقیقت کھلی کہ سطح زمین سے صرف بیس انچ نیچے سر موجود ہے (جلد نمبر ۲) سنگین فرش سے پسند ہی انچ نیچے یہ لٹو کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور اس کا قطر ۲ فٹ ۴ انچ ہو گیا ہے۔ یہ جڑ ہی سلاخوں کے ایک پنجرے کی طرح ہوئی ہے اور سلاخوں اور فرش کے پتھروں کو سیسے سے جوڑ دیا ہے۔

۱۸ رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی، جلد ہفتم، ۱۹۲۹ء

۱۹ رسالہ انٹرنیشنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جلد ۶۳، ۱۹۰۳ء۔ ڈاکٹر فریڈرک اپنی کتاب "ہنس کرپ شنز اور فن" میں اریا گپتان (حاشیہ صفحہ ۱۳۹) میں پہلے قول کی تصحیح کرتے ہیں کہ یہی چندر راج کی لوبہ و ناسہ فتوحات کی یادگار ہے۔ مگر اس ماحول کا خاندان اور زمانہ کہتے ہیں کہ یہیں درج نہیں ہے۔

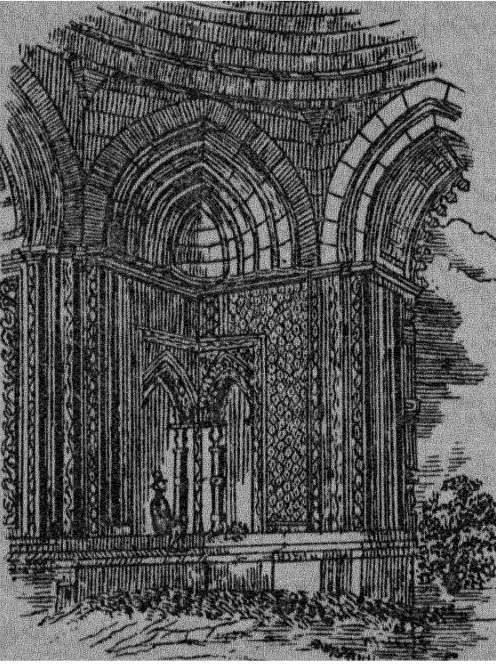
یہ ہے کہ گپت خاندان کے چند راجہ کسی راجہ نے بنائی ہے اور اس حساب سے  
 سن ۳۰۰ یا ۳۵۰ء کے قریب کی بنی ہوئی ہے۔  
 سن ۳۰۰ء کو بن بن تاریخ سمجھ کر جو حقیقت میں صداقت سے زیادہ بعید نہیں ہے  
 ہمیں اس حیرت انگیز کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانے میں اہل ہند اتنی  
 بڑی لوہے کی لاٹھ ڈھالنے کی قابلیت رکھتے تھے کہ زمانہ قریب تک یورپ میں بھی  
 اتنی بڑی لاٹھ نہیں ڈھال سکی تھی اور اب بھی عام طور پر نہیں ڈالتی۔ پھر کنارک کے مندر  
 کے پیش پر ہم انہیں صدی بعد اسی قسم کی لاٹھوں سے چھت یا پٹے دیکھتے ہیں۔  
 تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس دھات سے ان کی واقفیت جس قدر پہلے تھی، بعد میں  
 اتنی نہیں رہی۔ قریب قریب اسی درجہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ چودہ صدی تک  
 بادوباراں کے پتھریلے کمانے کے باوجود اس پر زنگ نہیں آیا اور سہ مینار و کتبہ  
 آج بھی ایسے ہی صاف اور ترشے ترشائے ہیں جیسے چودہ سو سال پہلے لاٹھ نصب  
 کرنے کے وقت تھے۔

جیسا کہ کہتے سے معلوم ہوتا ہے یہ لاٹھ وشنو کی نذر کی گئی تھی اور اس میں  
 شبہ کی گنجائش کم پائی جاتی ہے کہ اس کی چوٹی پر گردودا کی صورت ہوگی جسے  
 ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے ہٹا دیا ہوگا لیکن اس کا اصل مقصد وشنو دیوتا کا جھنڈا  
 نصب کرنا تھا کہ ”واہلیکاوں“ کو سندرھو (دیرا) کے ساتوں دیوانوں کے پار  
 شکت دینے کی یاد دگایا رہے۔ یہ کہنا عبارت آرائی میں داخل نہ ہوگا کہ یہ بھی  
 عجیب اتفاق ہے کہ اسی ملک باختہ کے لوگوں نے جن کے اسلاف کو اہل ہند  
 نے شکت دے کے اپنے ملک سے نکالا اور اس کی یاد دگاری میں یہ لوہے کی لاٹھ  
 نصب کی تھی، اٹھ سو برس بعد اہل ہند پر فتح پائی اور یاد دگاری میں ہندو لاٹھ

۲۰۹

اس لاٹھ کے خالص لوہا ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لگتا ہے ہم نے اس کے ایک ٹکڑے کی ہندوستان میں  
 اور پھر واکر ٹرس نے دلایت پمپل کی تو اسے خالص اور غے شس لوہا پایا۔  
 ملے کیا یہ واکر ٹرس ہی تھی لوگ تھے جنہیں شکت دے کر گپتا خاندان عروج حاصل کر سکا تھا، سنسکرت  
 کتابوں میں واکر ٹرس عام طور پر بنایا یا باختہ کے باشندے ملے ہوتے ہیں۔

دس گنا بلند مینار اسی صحن میں تعمیر کیا جہاں یہ پہلی لاٹھ نصب تھی! مسجد کے شمال مغربی گوشے کے عقب میں ملا ہوا، بانی مسجد سلطان شمس الدین ایتھش کا مقبرہ ہے اس کے اندر صرف ۲۹ فٹ ۶ انچ مربع کا حجرہ ڈھائی گز چوڑی چار دیواری اور چاروں رخ دروازے ہیں۔ ہر چند یہ چھوٹی سی عمارت ہے لیکن پرانی دہلی میں ہندی



صناعی سے اسلامی اغراض کیلئے جو کام لئے گئے ان میں اس سے بڑھکر پرتھوہل نمونے کم ہوں گے۔ اور اگرچہ معماروں نے اپنے مقاصد میں فن کی جزئیات سے کام لینے میں کسی قدر اناڑی پن دکھایا ہے، تاہم یہ بہت خوبصورت عمارت ہے بہت عرصے سے اس کی چھت برباد ہو گئی ہے اس لئے جیسی چاہیے شان باقی نہیں رہی لیکن حسن صنعت کی مثال ہونے کے علاوہ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں تک معلوم ہو سکا یہ ہندوستان کا

نقویر ۳۵

سب سے قدیم مقبرہ ہے۔ سلطان کا انتقال ۱۲۳۵ء میں ہوا پھر اس سے بھی زیادہ خوبصورت نمونہ علامی دروازہ ہے جسے علاء الدین خلجی نے بنوایا اور اس کے کتبات میں سنہ ۱۳۱۵ء مذکور ہے۔ گویا یہاں کی دوسری

۱۔ اسٹیفنسن "آرکیولوجی" ۱۸۷۴ء، ۵۵ء، فن شاکی "دہلی پاسٹ اینڈ پریزنٹ" ۱۶۹ د ۲۰۰ -

عمار توں سے یہ تقریباً سو برس بعد کا ہے۔ اور نام نہاد پٹھان طرز کے عہد عروج کی یادگار ہے جب کہ ہندی معمار بیرونی آقاؤں کی ضروریات کے مطابق اپنی اصلی صناعی سے کام لینا سیکھ گئے تھے بلکہ اس کی دیواروں پر اندر کے رخ ایک قسم کا متحرک نہ کیا ہے کہ حتم و خوبی میں جواب نہیں رکھتا۔ اس میں مربع بل کھا کے جس طرح مشن بن جاتا ہے اور اس میں جو صوفیانہ سن پایا جاتا ہے اس کی دوسری مثال ہندوستان بھر میں مجھے کہیں نہیں ملی۔ چاروں رخ نوک دار مفصل دے کے جو آویزے بنائے ہیں وہ باہم کمال مطابقت رکھتے ہیں اور ہر اعتبار سے ان کی جوبانی ترتیب مناسب ہے بلکہ شبہ بعض نقص پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ عمارت کے حصّہ زیریں میں اندر اور باہر کے رخ فسی کنجان جھلکا رہی کی ہے ان کے لحاظ سے یہ نقش بالکل سادہ نظر آتے ہیں لیکن ان میں نقش و نگار بڑھادینے کچھ مشکل نہ تھے۔ لہذا ان کی سادگی خود گہند کی سادگی کے مطابق سمجھنی چاہئے جو فی الواقع بیچے کی عمارت کے جوڑ کا بنا ہوا نہیں ہے۔ اس میں روشندان نہیں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اندھیرارنے سے باعث اس سادگی پر کسی کی نظر نہ جائے گی۔ یہ عمارت جو باہر سے نقشے کے اعتبار سے ۶ فٹ ۹ اور اندر صرف ۳ فٹ ۳ مربع ہے، مختصر ہونے کے باوجود دہلی میں پٹھانی طرز کا مہتابے کمال پیش کرتی ہے۔

اس مؤلف کا یہ مفروضہ غلط ہے کہ ان عمارتوں کے متاع و عمار لازماً ہندی تھے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس موقع پر یہ نتیجہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مؤلف کی پوری تحریر اس نظریہ پر مبنی ہے کہ اسلامی عمارتوں پر استبدادی سے ہندی اثرات پڑ رہے تھے۔ حالانکہ یہ خیال تاریخ اور بہت دوؤں کے خلاف ہے۔ تازہ اردو مسلمانوں کے دل میں بلجبال ہند کی دل اول کوئی وقت نہ تھی اور ان کی ابتدائی تہذیب و معاشرت ہندی اثرات سے بالکل آزاد رہی۔ اس زمانہ میں انہوں نے جو عمارتیں بنائیں وہ بھی خالص اسلامی طرز کی اور دعوت و استیقام کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہیں۔ البتہ آگے چل کے جس نسبت سے ہندی اثرات بڑھتے گئے۔ عمارتوں میں خالی نمائشی خوبی اور کمزوری نمایاں ہونے لگی۔ ترجمہ

اس آویزوں کی شکل مذکورہ بالا عہد سے دھندلی پہلے سرستان میں بھی لگی ہے (دیکھو مہشوری.....)

ار کی ٹیکچر طبع سوم۔ جلد اول ۳۹۶۔ وغیرہ۔

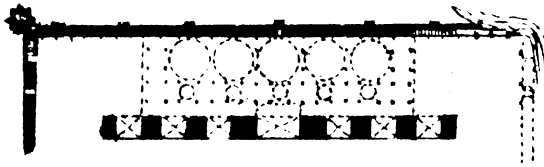


اتنی کمال چیز پہلے تیار نہ ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد انھوں نے اس قدر  
 مزین عمارت بنانے کا ارادہ کیا۔ باہر صوبوں میں اس عہد اور مغلیہ فتوحات کے  
 مابین عجائب عمارتیں تیار ہوئیں مگر خود پائے تخت کی عمارات میں تزئین یا فن تعمیر کی  
 اعلیٰ اندرثوں کی بجائے عریانی اور اسودہ مسامت نمایاں ہے یہ علاقہ دروازہ  
 باہر سے بہت کچھ خراب ہو گیا ہے لیکن اس کا اثر ابھی تک دیا ہی ہے جیسا  
 ہندوستان میں اس قسم کی کسی دوسری عمارت کا ہو گا۔ سکندر لودھی کے  
 زمانہ (۱۵۱۹ء) میں معظدر خاں کے مقبرے کے قریب موضع خیر پور کی خوبصورت  
 مسجد کا نفیس دروازہ کچھ رد و بدل کے ساتھ اسی علاقہ دروازہ کے نمونے پر  
 تعمیر کیا گیا تھا۔

## اجمیر

اجمیر کی مسجد کی تعمیر بظاہر ۱۵۱۹ء میں شروع ہوئی اور تکمیل تو یقینی طور پر  
 الہش کے عہد (۱۵۱۹ء تا ۱۵۲۶ء) میں ہوئی ہے۔ روایت یہ ہے کہ ساری مسجد  
 ڈھائی دن میں بن گئی تھی اور اسی لئے عام طور پر ”اڑھائی دن کا جھونپڑا“ کہلاتی  
 ہے جس کے اگر کچھ معنی ہوتے ہیں تو صرف یہ کہ اتنے عرصہ میں ہندو مندروں اور  
 مورتیوں کو صاف کر کے مصاحف جمع کیا گیا ہو گا کہ فاتحانہ بت شکن اور دین اسلام  
 کی عظمت و جلال کے مناسب ایک عالیشان مسجد تعمیر کی جائے۔ یہ مسجد تارا گڑھ  
 کی پہاڑی کے دامن میں شہر کی حد پر واقع ہے اور پرانی دہلی کی مسجد کی طرح  
 اس کا پورا نقشہ اسلامی ہے لیکن ستون اور تختیں ہندو مندروں سے غنیمت میں لی گئی  
 ہیں۔ پہلی نظر میں ہر طرف دالان اور بیچ میں صحن دیکھ کر یہ جینی مندروں کے مشابہ  
 معلوم ہوتی ہے اور چھتوں کے نیچے ستونوں کی ہشت پہلو ترتیب سے بھی اس

خیال کی تائید نکلتی ہے لہٰذا لیکن اکثر دوسری مسجدوں کی مثل یہ دالان بطور چار دیواری کے بنائے گئے ہیں جن کا رقبہ باہر سے تقریباً ۲۹۲ فیٹ مربع ہے بلکہ اور کوٹوں پر بنیاد بنا کے ان کے تین طرف کھلے ہوئے حجروں کا سلسلہ تیار کر دیا ہے۔ ان حجروں یا برآمدوں کو بندوستوں پر قائم کیا تھا جو اب بالکل شکستہ ہو چکے ہیں۔ صدر دروازہ حسب توقع مشرق کی جانب ہے لیکن جنوبی رخ بھی ایک سائبان دار دروازہ تھا۔ شمالی پہلو پہاڑی کی مقدس چٹان کے متصل بنا ہوا ہے اور اندر کا صحن قریب قریب ۲۰۰ فیٹ لمبا اور مغرب کے دالان تک ۵۵ فیٹ چوڑا ہے۔ یہی مغربی حصہ ابھی تک سلامت رہ گیا جس کا نقشہ حسب ذیل ہے :-



نقشہ نمبر ۷۷

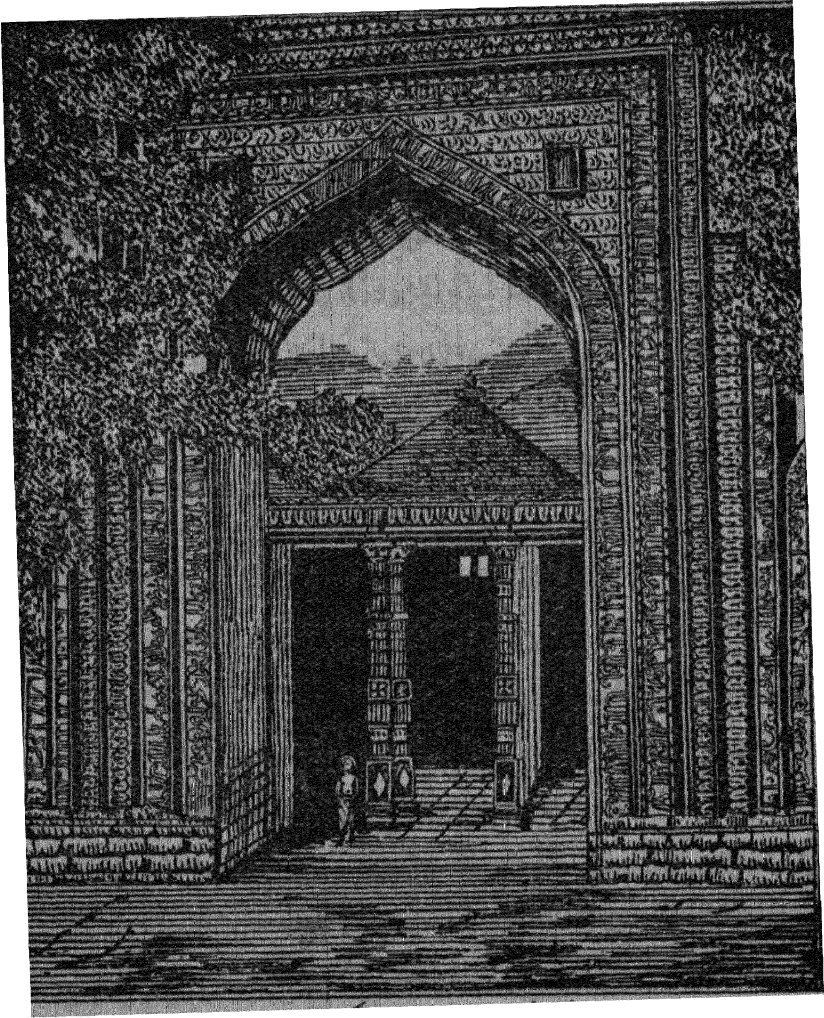
شمال مغربی گوشے پر غالباً کوئی رخ نہ تھا اور جنوب مغربی گوشے پر ایک چھوٹا سا دیول تھا جس کا سکھ اثرا مندھم کر دیا گیا۔ لیکن صحن کے مشرقی کوٹوں پر جو برجیاں ہیں وہ اسلامی اور اسی صحن کی ہیں جیسی کہ صدر دالان کے وسطی یاہوں کے اوپر تنگورے بنے ہوئے ہیں۔ مشرقی جانب کے سقف کو دوبارہ بنایا گیا ہے لیکن

۱۔ چنانچہ ٹاڈ نے اسے معنی مجنی مندر سمجھ لیا ہے اور سوائے بعض اضافوں کے اصل عمارت میں مسلمانوں کی کسی تہم تک کا اسکان نہیں بیان کیا۔ (جلد اول، ۷۹، ۸۰، نیز ملاحظہ ہو اس کا خاکہ جو بالکل درست ہے) ۲۔ کنگنا تہم کی پالش اور خاکے میں اختلاف پایا جاتا ہے اس نے شمال سے جنوب تک کی بیرونی لمبائی ۲۵۲ فیٹ، لکھن پھر دوسرے ہی صفحے پر مسجد کی لمبائی (باہر سے) ۲۵۹ فیٹ لکھی ہے اور خاکے میں چاروں طرف کی طول مساوی تحریر کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے اس کی پالش ۲۶۲ فیٹ ۱۶ انچ ہے تو

یہ پہلے نقشے کی نسبت بہت کم چوڑا ہے۔ شمالی سقف کا کوئی اثر آثار نہیں رہا اور جنوبی کی صرف دیوار باقی ہے۔ بہر حال جو کچھ باقی ہے وہ بھی یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ کجالتِ کمال یہ دراصل ہندوستان کی قدیم مسجد کا نہایت خاص اور پرشکوہ نمونہ ہوگی۔ نوپوری چھت صرف ۶ پاؤں ارتفاع کی ہے جس کا کل طول ۱۲۱ فٹ کے قریب ہے اور اس کے آگے دونوں سرے کھلے ہوئے بلکہ نیچے فرش بنائے بغیر چھوڑ دیئے ہیں۔ پاؤں کے عقب میں اصل مسجد کا عرض ۲۰ فٹ ۸ انچ ہے۔ پوری چھت ہندو سنگین ستونوں کی چار اور صندلے کے ستونوں کی جو عقیسی دیوار میں ملے ہوئے ہیں ایک قطار پر قائم ہے۔ ان کی کل تعداد تیرہ ہے اور ان میں ہر ایک تین تین ہندی گھمبول کو ملا کر تیار کیا گیا ہے۔ پوری چھت پانچ گنبدوں یا مخروطی قباب پر مشتمل ہے اور ہر ایک کے نیچے قدیم جینی یا مہندو مندروں کی ترتیب کے مطابق آٹھ آٹھ ستون استادہ ہیں۔ یہی پانچ مخروطی قباب ہیں جو اب تک سلامت رہے ہیں۔ لیکن قطب کی مسجد کی طرح اس مسجد کی بھی اصلی شان سات کمانوں کی اس حجابی دیوار سے ہے جس سے آسمان نے صحن کو مرتن کیا تھا۔ اس کے عرض طول بھی اپنی مشیل مسجد کے مساوی ہیں یعنی وسطی کمان ۲۲ فٹ ۲ انچ دو دوغلی کمانیں ۱۳ فٹ اور آخری سرے کی ۱۲ فٹ ۸ انچ چوڑی ہیں۔ ہر کمان پر تین تین سطریں کندہ ہیں۔ پہلی سطر کوئی اور باقی دو عربی خط میں ہیں اور ان کے درمیان جدولیں بنا کے نہایت صاف اور ابھرے ہوئے عربی نقش و نگار بنا دیئے ہیں جن کی تراش خراش آج بھی ایسی ہے جیسی کندہ کرنے کے وقت تھی۔

(تصویر منظر دیگر)

۱۔ ان قدیم قباب کی شکل نیچے کے مخروطی عمارت کے مطابق تھی جنہیں بدنام سمجھ لایا گیا اور چند سال ہوئے آکیولوجی کی سرور میں انہیں ہٹائے بہتر شکل کے نیم گردی قباب بنادیئے گئے۔



تصویر نمبر ۱۰۰ مسجد اجماعی دہلی لہان

مطالعہ یحجالی دیوار ۶۵ فیٹ کی بلندی تک پہنچتی ہے اور اس پر دو میناروں کے  
اشارہ موجود ہیں جن کا قطر ۱۰۰ فیٹ ہے اور جنہیں قطب مینار کے پچھلے درجے کی طرح  
بچے بعد دیگرے سہ دور اور مثلاًشی مل بنا کے مزین کیا گیا تھا معلوم نہیں اس قسم کے  
مینار دہلی میں بھی تھے یا نہیں لیکن قیاس چاہتا ہے کہ وہاں نہ ہونگے اور بڑا مینار  
ہی اسی غرض خیلے کافی سمجھ لیا گیا ہو گا۔ خود اس جگہ ان کی تعمیر بعد کا خیال

معلوم ہوتی ہے جسے کسی کم مشق کاریگر نے جنبی طرز میں تعمیر کیا ہو۔ بعد میں جہاں کسی مینار بنائے گئے، ان کی تیاری بنیادی سی سے شروع ہوئی اور زمین تا آسمان کے خطوط لائے گئے ہیں جیسا کہ بقاعدہ فن ہونا چاہئے۔ مسجد اجمیر کے معاملے میں یہ زالی بات نظر آسکتی ہے جو غلطیوں سے شروع ہوئی کہ راج مہاراج نے اس طرز سے ناواقف تھے۔ کمانوں کے عمودی اصول پر بنانے کی بھی وجہ یہی ہے۔ صحیح معنی میں کوئی کمان یا قوس اس مسجد میں نہیں ہے لیکن چونکہ یہاں دہلی کی نسبت بڑے پتھر میسر تھے لہذا کمانیں شکستہ نہ ہوئیں اور مرمت ہونے تک قائم تھیں۔

لیکن اس جگہ دیوار کی کمانوں کا عرض یا ارتفاع انھیں ہندوستان کی سب سے قابل دید عمارات میں شمار کرانے کا باعث نہیں ہے بلکہ اس کا سبب ان کا طرز تزئین ہے جس میں حسن ذوق کے ساتھ کوئی اور طرز ملی خطوں کو خالص تعمیراتی نقش و نگار سے ملائے گئے ہیں کیا ہے، اور جس طریق پر عمارت کے خطوط ترکیبی سے تعارض و تخالف ہوئے بغیر ان سے پوری تعمیر میں جان ڈالی اور تنوع پیدا کیا گیا ہے اس سے بہتر ہو نہیں سکتا جیسا کہ پہلے رائے ظاہر کی جا چکی ہے، غالباً الشمس کی دہلی اور اجمیر کی ان مسجدوں کے دیواری نقش و نگار کی کہیں نظیر نہ ملے گی۔ جملہ باریکیوں کے اعتبار سے قاہرہ یا ایران میں کوئی چیز اتنی کامل حسن نہیں ہے اور اسپین و شام کی کسی دیوار کی نقاشی ان کو نہیں پہنچتی۔ دوسرے ان میں طرفگی یہ ہے کہ اس طریق سے اور اس حد تک مسلمانوں کی وسعت تصور اور ہندوؤں کی باریک صناعی کی آمیزش اور کہیں نہ مل سکے گی بلکہ ان خصوصیات میں یہ اور اضافہ کیجئے کہ ہندوستان کی سب سے پہلی مسجدیں ہونے کے اعتبار سے تاریخی قدر و وقت رکھتی ہیں اور مختلف نسلوں کی ممتاز خصائص کو اسے واضح اور نمایاں طریق پر پیش کرتی ہیں کہ انھیں ایک نسلیاتی وقت حاصل ہوگئی ہے۔

اس سے یہ فاضل مولف کی کمال دیدہ دلیری یا محض مسلمانوں سے مغرور تعصب کی دلیل ہے کہ وہ نقاشی اور دیگر کلا کی اس خالص اسلامی صفت کو ہندوئی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ مالاںکہ عمارات کو مختلف خطوں میں کشیدہ کرنا تمام اسلامی ممالک میں عام ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم میں اس کا رواج نہیں پایا جاتا تو مترجم

غرض یہ سب باتیں مل کر انہیں یقیناً حکومت کی حفاظت و توجہ کا سب سے زیادہ مستحق بناتی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد پر خاصی طرح توجہ بھی کی گئی ہے لیکن دوسری سے زیادہ قریب تک شرمناک بے اعتنائی برتی گئی اور نہایت وحشیانہ سلوک کیا گیا ہے۔

## بعد کا ”پٹھان“ طرز

علاء الدین خلجی کی وفات (۱۲۹۷ء) کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ عبد تغلق و سادات کے معماروں کی طبائع میں تبدیلی واقع ہوئی اور شیر شاہ افغان کے زمانے (۱۵۲۹ء) تک کی عمارتوں سے نقشے کی انتہائی سادگی ٹپکتی ہے جو امتدادی بہت کم ترین کے مقابلے میں بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ یہ قدیم نمونوں کی نیم مند وانی وضع سے کسی مذہبی رجحان کا اثر ہے یا ایسے سیاسی اسباب سے جن کے نتائج کا اب یہ چلانا دشوار ہے، یہ کیفیت پیدا ہوئی۔ بہر نوع، آنا مسلم ہے کہ جس وقت خشک مزاج کہن سال جنگ جو تغلق شاہ نے ۱۲۹۷ء میں ایک اور دہلی بسائی جو اب تک اس کے نام سے منسوب، یعنی تغلق آباد کہلاتی ہے تو اسلاف کی عمارتوں کے خلاف اس کی ہر تعمیر میں شدید سادگی سے کام لیا گیا حالانکہ قدیم پائے تخت قریب ہی موجود تھا اور وہاں وہ میدان زیر قدم نظر آتا تھا جس میں تغلق کا نیا قلعہ تیار ہوا۔ اس کا مقبرہ بھی، جس کی بنا نہیں تو یقیناً اس کے جانشین کے ہاتھوں ہوئی، بجائے کسی بارغ میں ہونے کے جیسا کہ معمول تھا، ایک علیحدہ اور مضبوط قلعے کے اندر تعمیر کیا گیا جس کے چاروں طرف تالاب کھود دیا ہے۔ اس مقبرے کی سلامی وارد دیواریں قریب قریب مصری آثار کی سی سختی، گرد کی فضیل اور دمدموں میں آگے نکلے ہوئے زبردست

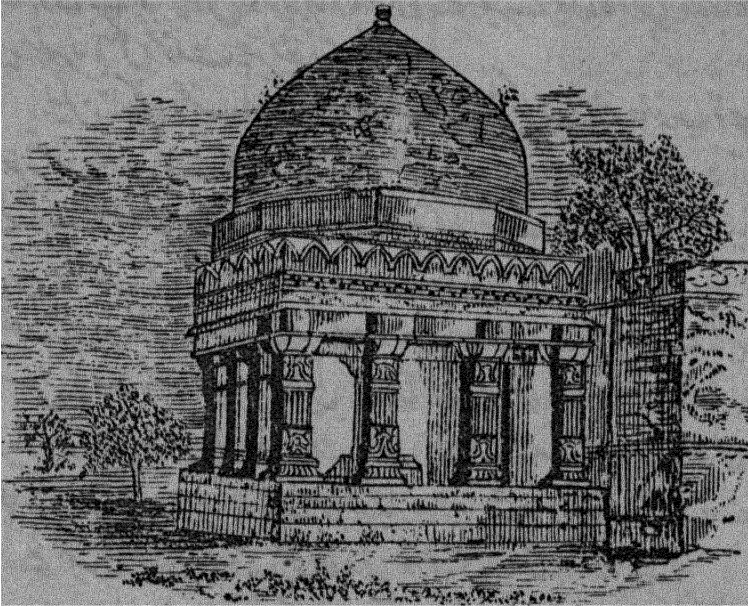
۱۔ اجمیر کی مسجد کا جو حصہ مسلمانوں نے تعمیر کیا وہ بہرہ و سخی تر مصالح سے بنا تھا، لہذا وہ آئی شکستہ حالت میں نہیں مچی کہ قلعہ کی مسجد مرمت سے (جسے ۴ برس ہوئے) قبل تھی لیکن جہاں تک میں رائے قائم کر سکا ہندوستان میں کوئی عمارت اس اجمیر کی مسجد سے زیادہ حکومت کی توجہ کے قابل نہیں ہے،

برج، مایہ سب مل کر ایک غازی کے مقبرہ کا ایسا نمونہ مرتب کرتے ہیں جس کی نظیر ملنی دشوار ہے اور زیادہ امن پسند یا توطن گزین خاندان کے آئینہ بادشاہوں نے جو غنیمتیں اور پر بہار باغوں کے مقبرے بنوائے ان کے مقابلے میں یہ مقبرہ بالکل مختلف چیز نظر آتا ہے۔

لیکن تاریخی اعتبار سے یہ تعمیر سب سے بڑے کمراس لئے جاذب توجہ ہے کہ یہ طرز تعمیر اس بات کا ثبوت ہے کہ تغلق شاہ کے وارث تخت و تاج ہونے تک مسلمانوں نے اپنے آپ کو ہندی اثرات سے بالکل آزاد کر لیا تھا۔ تغلق کی عمارتوں میں جتنی محرابیں ہیں وہ سب صحیح محرابیں (یا قوسیں) ہیں اور خزیات میں تقلید نہیں کی گئی بلکہ ہر مقام کے مناسب جدت سے کام لیا ہے حقیقت میں اس کا مقبرہ جہان کی بجائے نیل کے کنارے پر بھی ایسا ہی لگتا ہے یہ ہے کہ کچھ زیادہ موزوں ہوتا۔ بالفاظ دیگر اس وقت سے ہندوستان میں اسلامی طرز تعمیر بجائے خود ایک جدید اور کمال طرز ہو گیا اور دنیا کے دوسرے حصوں کے سچے طرز ہائے تعمیر کی طرح اس میں بھی قدرتی اور لازمی ارتقا ہونے لگا۔

بایں ہمہ یہ درست ہے کہ اپنے مقابر و مساجد میں مسلمانوں نے اکثر محنت سے بچنے کے لئے ہندی مصالحے سے جہاں کہیں میسر آیا، کام لیا اور بار بار ایک تازہ خوش نمائی پیدا کر دی۔ اسی مرکب عمارتوں میں بہت سی صرف چار گنجیوں کی ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے گنبد بنا دیئے ہیں مگر اکثر اوقات جہنی ستونوں کی طرح ان کی بارہ درمی کی ترتیب بھی اختیار کر لی گئی ہے جو بہت پہلو عمارتوں میں دیئے جاتے تھے اور جن پر گول آثار دے کر گنبد بنا نا مہل تھا۔ بسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، مئی لاسا کے مقبرے کی ترتیب یہی ہے اور علیٰ نذا جنہی اور شہائی ہند کی عمارتوں کے نقشے کی ساری خوش نمائی بھی اسی مذرت کا نتیجہ سمجھنی چاہیے۔ ان عمارتوں کی کیفیت ظاہر کرنے کے لئے صرف ایک مثال پیش کرنی کافی ہوگی۔ یہ گوالیار کے جنوب مغرب میں شریل پستیر کی عمارت ہے۔ پہلی نظر میں گنبد نیچے کی عمارت کے مقابل زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے مگر مجموعی طور پر اس کی نظر فریبی نکست چھینی کی زبان بند کر دیتی ہے۔

اگر جملہ اجزاء ترکیبی



تصویر نمبر ۲۸ "سیپری کا مقبرہ"

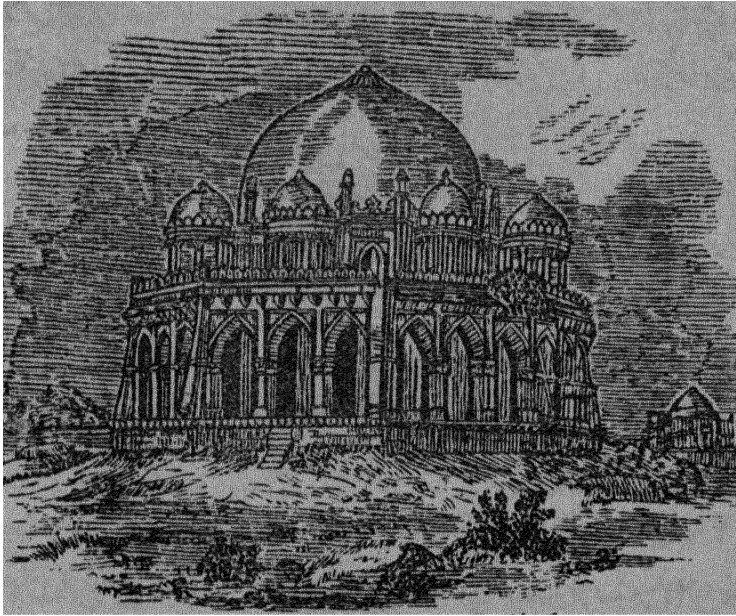
اجتہادی ہوتے تو اعتراض کی گنجائش تھی لیکن جب کہ اس کا ایک حصہ صریحاً مستعار لیا گیا ہے، تو دوسرے اجزاء سے اس کا خفیف سا عدم تناسب نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

بنارس میں بکریا کنڈ پر بھی اس نمونے کے کئی مقبرے موجود ہیں جنہیں بظاہر پرانے لمبے سے تیار کیا گیا تھا لیکن جہاں کہیں مسلمان ایسے مقام پر جو پہلے ہندو جنینی یا بودھ مت والوں کی سبتیاں تھیں، اچھی طرح آباد ہو گئے تھے وہاں ایسے مرکب بنونے جا رہے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ اسلامی اجزاء کو ہندی طرز میں مدغم کرنے کی کبھی کبھش نہیں کی گئی اگرچہ اس ہندی طرز کو اختیار کر لیا گیا ہو۔

لہہ رمالا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، جلد سی و چہارم، از صفحہ (۱)



یہ عمارتیں جس زمانے میں بنیں اسی کی یادگار ہیں اور جو شخص اس طرز سے واقف ہے وہ بلا وقت ان کا زمانہ معلوم کر سکتا ہے۔  
 پٹھان مقبرے کی عام صورت ذیل کی تصویر سے بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی۔  
 یہ ان صد ہا مقابر میں سے جو ابھی تک پرانی دہلی کے میدانوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ایک نامعلوم الاسم کا مقبرہ ہے اور دہلی کے جنوب میں جمیری دروازے سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر موضع خیر پور میں مسجد کے جنوب مغرب کی طرف بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک بہشت پہلو



تصویر نمبر ۲۳ ”خیر پور کا مقبرہ - پرانی دہلی“

کمرہ ہے جس کا اندرونی وتر ۲۱ فیٹ ۱۰ انچ ہے اس کے گرد اسی شکل کا برآمدہ

۱۵ کنگہم کہتا ہے کہ اسے مبارک خاں پٹھان سے منوب کرتے ہیں (ریپبلک سہم، ۱۵۰)۔  
 فن شاہی محمد شاہ چارم دستونی (۱۸۴۴ء) کا مقبرہ بتاتا ہے (دہلی، ۱۸۴۰ء) مگر سید احمد خاں نے مسجد

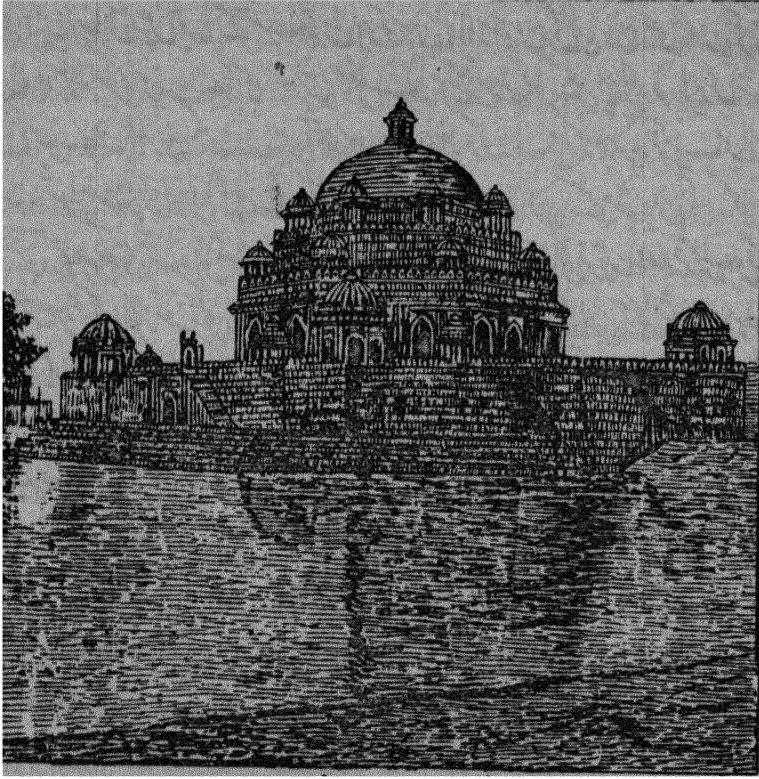
دیا ہے اور کل عمارت کا عمود ۲۰ فٹ ۲ ہے۔ ہر پہلو میں چھان یا زیادہ صحیح یہ ہو گا کہ خاندان سادات کے عام طرز عمارت کے مثل لمبے ستون اور نکلی توں کی تین تین محرابیں بنائی ہیں جن کے ستون چوکور ہیں اور ستون کی یہ وضع بھی ان کی محرابوں کی طرح ہر جگہ مروج ہے، یہ وضع بظاہر جینیوں کے چوکور یاوں سے لی گئی ہے لیکن اسے اتنا بدلا اور سادہ کر دیا ہے کہ جدید ترکیب میں اس کی اصلیت شناخت کرنی خاصی دقیقہ رسی کی محتاج ہے۔

مسجد کے شمال مشرق میں ایک اور مٹمن مقبرہ اسی طرز میں اور قریب قریب اسی عرض و طول کا بنا ہوا ہے۔ مبارک شاہ ثانی از مقتول ۱۲۳۴ھ کا مقبرہ جو مبارک ر یا کوٹلی میں خیر پور سے جانب جنوب تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے اس کا نمونہ اور عرض و طول بھی ایسا ہی ہے اور یہ متاخرین سلاطین دہلی کے ”چھان“ طرز کی سب سے قدیم عمارت ہے۔

مقبروں کے اس سلسلے کی آخری کو می شیر شاہ (عہد بادشاہی ۱۵۳۹ھ تا ۱۵۵۵ھ) کا مقبرہ ہے جو نسل افغانہ میں سب سے نامور بادشاہ تھا۔ یہ ۳۰ فٹ اونچی اور ۳۰۰ مربع فٹ وسیع کرسی پر، ہتھسرام (خلع شاہ آباد) کے قریب ایک بڑے تالاب کے وسط میں بنا ہوا ہے اور محل وقوع اور وضع کے اعتبار سے اب نہایت عجیب اور خوشنما چیز ہے۔

تصویر برصغور دیگر

بقیہ حاشیہ مکرشتہ شمال مشرق کے ایک درخت پہلو مقبرہ کو اس بادشاہ کا مقبرہ بتایا ہے کہ  
۱۵ گنگ سیم نے اس کا خاکر دیا ہے۔ رپورٹس سیم، لورن نمبر (۲۵)



تصویر نمبر ۳۸۲ "شیرتہ کا مقبرہ سیرام میں"

اس کا عرض و طول بھی کچھ کم نہیں جنت پہلو قاعدے کا ہر پہلو ۵۶ فیٹ ۱ اور  
عمود ۳۵ فیٹ کا ہے۔ بیچ سے ایوان کے گرد ۱۰ فیٹ ۱۲ بیچ چوڑی غلام گردش  
بنا کے اس کے اوپر ایک عظیم الشان گنبد تعمیر کیا ہے جس کا قطر ۱۰ فیٹ ہے اور  
اسی کے نیچے بانی کی قبر اور اس کے بعض رفقاءے جنگ نمودہ ہیں جو  
باہر سے رخ کرسی کے گوشوں کی خوب الجھری ہوئی برجیوں سے زینت  
بڑھائی ہے جو رخ گنبد کی نہایت خوبی سے معاونت کرتی ہیں اور ان کے درمیان  
کی چھوٹی چھوٹی چھتریاں خط تعمیر میں ایسا انقطاع پیدا کر دیتی ہیں جس سے منظر کا لطیف  
دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خود گنبد کے ڈھولنے کے ارد گرد جو گنبدیاں تعمیر کی ہیں

ان سے اور خود گنبد سے ظاہری متانت و استحکام میں فرق پڑے بغیر ٹوری عمارت میں تنوع آگیا ہے۔ غرض مجموعی طور پر دوسرے درجے کے شاہی مقبروں میں ہندوستان کا کوئی مقبرہ نقشے کی صفائی یا اجزاء کے تناسب کے لحاظ سے اسے نہیں پہنچتا۔ ابتدا میں شکی سے اس تک پہنچنے کے لئے پل بنایا ہوا تھا لیکن غنیمت ہو اگر انگریزی ٹریٹک ٹینے سے قبل ہی یہ پل ٹوٹ گیا تھا ورنہ یہ مقبرہ بھی کاسرکاری مصرف میں آچکا ہوتا۔

ان سلاطین دہلی کی مساجد کی بھی شان یہی ہے جو ان کے مقبروں کی۔ کلاں یا کانی مسجد جو موجودہ شہر دہلی میں موجود ہے اور دیوار کے ایک سمتیہ کی رو سے سترہ سو تکمیل کو پہنچی اس کی طرز تعمیر بھی غیر ٹوری والے مقبرے جیسی ہے۔ اگرچہ اس کے آثار زیادہ جوڑے میں اور سامان زینت مقبرے کے برابر بھی نہیں پایا جاتا۔ یہی خشک متانت جو دھوین صد کے آخری حصے کا امتیازی وصف بن گئی تھی اور مہن نے کہ یہ ہندوانی تکلفات کی افراط کے خلاف جو تیرہویں اور نیز پندرہویں صدی کی خصوصیت تھی اسلام کی سادگی پسند کا مظاہرہ ہو۔ بہر حال یہ سادگی قائم نہ رہی اور سلطنت دہلی کا بعد کا طرز تعمیر سب سے قدیم طرز سے (جس کا نمونہ قطب کی عمارت میں) کچھ کم پرچل نہ رہا بلکہ اپنے مقاصد تعمیر کے واسطے تو ان قدیم عمارتوں سے بھی نہیں زیادہ موزوں تھا۔

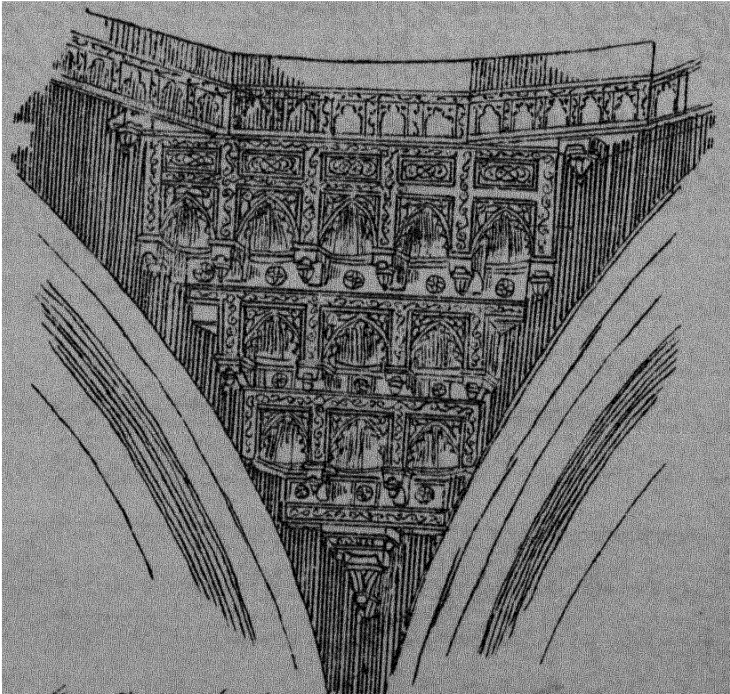
اس کا سب سے بڑا سبب عہد شیر شاہی کے غیر معمولی تزک و احتشام کو سمجھنا چاہیے لیکن یہ ابتدائی منزل بادشاہوں کے طرز سے اس طرح ریل مل گیا ہے کہ ان میں باہم امتیاز کرنا دشوار ہے۔ بہرچند سترہویں اور آٹھویں صدی میں ہندوستان فتح کر لیا تھا مگر اس کے باشندین کو شیر شاہ نے شکست دے کے ملک بدر کر دیا اور پھر سترہویں صدی میں سلطنت منلیہ دوبارہ مستقل طور پر دہلی میں قائم ہوئی۔ اسی لئے سولہویں صدی کے پہلے نصف کے طرز کو چٹھانوں کے آخری سنبھالے یا سلاطین منلیہ کے ابتدائی عروج کسی سے بھی منسوب کیا جاسکتا ہے اور حق یہ ہے کہ وہ دونوں میں سے ہر ایک کے شایان شان ہے۔

اس عہد میں سجدوں کی روکاریں زیادہ آراستہ بننے لگیں۔ ان میں اکثر سنگ مرمر کی بجائے لگی اور سنگ مرمر کی خوشنما اور پرچل وضع سے نہیں بلا استثناء فرین کیا جانے لگا۔ عمارتوں کے گوشوں

لے سال ۱۵۵۱ء میں ۱۵۵۴ء اور ۱۵۵۵ء میں ای دلیو ہستہ نے کالی کے ایک شکستہ مقبرے کا احاطہ سے تصویر مال تحریر کیا ہے۔ پھر اسے گنبد کہا ہے اور ۱۵۵۵ء میں ہے۔ دلی جو ۱۵۵۴ء میں اور اس کے گرد مرمر مقصد کے جائیں گوشے بنائے ہیں اور بڑے بڑے ان کے پاؤں چھتیں قائم کی ہیں۔

پر بھی برجوں سے تنوع پیدا کرتے تھے جن کے نیچے چار مرغولہ دار ستون ہوتے لیکن مینار کبھی نہیں بنائے جاتے اور جہاں تک مجھے علم ہے یہ اس نام نہاد پٹھانی عہد میں مسجد کا جزو نہیں تھے! اذان بھیت پر دینا ہی تھی اور ہوائے جمہور کی مسجد میں پہلی اور ایک بے دوہنگی کی کوشش تھی اور کسی جگہ اس زمانہ میں مجھے ایسے مینار کی مثال نہیں ملی جو محض اذان کی غرض سے بنایا گیا ہو حالانکہ مقصراور دوسرے ملکوں میں وہ اس عہد سے بہت پہلے سے عام طور پر بنائے جانے لگے تھے اور تھوڑے ہی دن بعد عہد مغلیہ کی مساجد کا بھی لازمی جزو سمجھے جانے لگے مگر معلوم ہوتا ہے ہندوستان کے پہلے مسلمان بادشاہ مینار کو اسی نظر سے دیکھتے تھے جیسے اطالوی کپانیل کو یعنی عبادت گاہ کا جزو ہونے کی بجائے اسے فتح و قوت کا نشان سمجھتے تھے۔

مسجدوں کی صدر عمارت علی العموم ایک مستطیل ایوان کی شکل کی ہوتی جس کے وسط میں طرکین اور بازوؤں میں پتھر چوڑے لیکن کم بلند دو کنبہ بناتے تھے ان کو وسطی کنبہ ہے ایک بعض و رفیع کمان جدا کرتی تھی جس سے حاشیہ نقش و نگار عمارت کے سب سے متاثرہ اڑھائیس ہوتے تھے تو باریک نقاشی کے اعتبار سے وسطی اویزے کمانوں سے بھی زیادہ قابلِ مینار بنائے جاتے تھے مگر ان کی



تصویر نمبر ۳۔ ”پرالی دہلی کی مسجد کا آویزہ“

اوضاع استقدر مختلف ہیں کہ ان کی قسم بندی یا کیفیت بیان کرنی محال ہوگی۔ شاید سب سے عام وضع وہ ہے جس کی اوپر تصویر دیکھی ہے اور جس میں نیچ کے فضل کو گڑ یا گھسر یا جھولی جھولی کہانیں بنا کے محصور کر دیا ہے اور ہر کمان مرغولے قسے ساتھ دوسری سے مل جھکی ہے۔ کمان غالب یہ ہے کہ اس قسم کی تزئین اندلس کے عربوں کی قریب نما کمان کے نمونے پر رائج ہو چکی، لیکن یہاں کے آویزے عربی عمارتوں کے آویزوں سے جو قوسی ہوتے تھے مختلف ہیں۔ اس لئے کہ یہ محض کونے کی دیوار گیریاں ہیں۔ اگر سلاطین مغلیہ کی جو انہی پائے تختوں میں ترک و افغانہ کے جاشین ہوتے، بعد کی شان و شوکت ان قدیم عمارتوں کو بالکل اند نہ کر دیتی، تو ان کے طرز عمارت پر یقیناً زیادہ توجہ کی جاتی اور ان کی جداگانہ کیفیت بھی ایسی ہی کچھپ اور سبق آموز ہوتی جیسی ہندوستان کے کسی دوسرے اسلامی طرز تعمیر کی نہ مختصر طور پر بیان کیا جائے تو اس طرز کے ابتدائی زمانے میں وہ سب باریکیاں موجود ہیں جو ہندی صناعتی پیدا کر سکتی تھی۔ دوسرے دور میں اس کی خصوصیت سادگی اور عظمت ہے جو ہمارے خیالات کے مطابق بانیوں کی طبائع اور مزاج سے زیادہ ہم آہنگ ہے مگر آخری دور میں ہم اس طرز تعمیر کو پھر پہلے دور کی باریکی اور جزئی تزئین کی طرف رجوع کرتے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اب ہر جزو اپنے مقصد اور مقام پر زیادہ موزوں و مناسب نظر آتا ہے۔ سوائے نازک کام کے اور کہیں ہندی صنعت کا کمان تک نہیں گزرتا اور اس آخری ارتقا میں دنیا کا ایک مکمل طرز تعمیر ہمارے مشاہدے میں آتا ہے تو

# باب چہارم

جونپور

جامع مسجد اور لال دروازہ

سنین

۱۳۹۴ء ..... خواجہ جہاں کا جونپور میں خود مختار ہو جانا

۱۳۹۹ء ..... مبارک (خواجہ جہاں کا سپر خواندہ)

۱۴۰۱ء ..... شمس الدین ابراہیم شاہ شرقی

۱۴۲۰ء ..... محمود شاہ شرقی

۱۴۵۲ء ..... حسین شاہ

۱۴۷۹ء ..... معزولی اور گور میں پناہ گزینی

مسلمانوں کے ہندوستان فتح کرنے کے ٹھیک دو صدی بعد خواجہ جہاں نے اپنی آزاد سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ وہ اس صوبے کا دلی تھاجس میں جونپور واقع ہے

۱۔ جونپور بنارس کے شمال مغرب میں تقریباً پہل کے فاصلے سے واقع ہے۔ یہاں کی عمارات پر ہندی شرقی اثر کی ٹیکچر اور فن جونپور میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے (مطبوعہ ۱۹۸۹ء) اور آدھر مند استھ عہد دار آدھر بول سر کے نقشوں سے ۴، ۷ تصویریں کتاب میں شامل کی ہیں تو

اس کا خاندان شاہی ۱۲۹۳ء سے تقریباً ۱۷۶۹ء یعنی کچھ کم ایک صدی تک آزاد حکمران رہا اور سندھ مذکور میں فرمانروائے دہلی سے مغلوب ہو جانے کے باوجود بھی کچھ عرصے نیم آزادانہ سی حکومت کرتا رہا تا آنکہ اکبر اعظم نے اسے دولتِ مغلیہ میں جوشہ کے لئے ضم کر لیا۔ لیکن اسی آزادی کے زمانے میں جو پور میں کئی عالیشان مسجدیں شہر کی زینت کا موجب ہوئیں جن میں سے تین اب تک خاصی طرح پوری کی پوری سلامت میں ان کے علاوہ قلعے اور پل سے قطع نظر جو بجائے خود ہندوستان کی اس قسم کی ممتاز ترین عمارات میں داخل ہیں، ایک مقبول تعداد متعارف محلات اور دوسری عمارتوں کی تیار ہو گئی ہے۔

ہرچند علاء الدین تغلق شاہ کے عہد میں دارالسلطنت کا طرز تعمیر ایک ملک درجہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا لیکن تعجب ہے کہ ان کے ایک عرصے بعد بھی جو پور میں جو بڑی عمارتیں اول اول بنیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبوں میں اس وقت تک یہ عمل کس قدر ناقص تھا۔ مسجد کے بڑے بڑے حصے جیسے دروازے، صدر و الاان اور عموماً سب مغربی عمارتیں کال بقوس (Arcuate) طرز میں ہیں اور جہاں ہیں کشادہ دریا اندرونی کھلے ہوئے فصل درکار تھے وہاں کمائیں گنبد یا گردی تھے استعمال کئے گئے ہیں اور ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انہیں دارالسلطنت کے طرز تعمیر سے ممتاز کرتی ہو لیکن صحنوں کے گرد جو پچھلیاں اور اندر جو سلام گردشیں بنائی ہیں ان میں چھوٹے چھوٹے مربع ستون، خمیدہ سرستون، سیدھے گردے اور چھٹی ٹیپوں کی چھتیں جا بجا موجود ہیں جیسی ہندو اور چینی مندروں میں بلا استثنایاً پائی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے مخلوط ہو جانے کی بجائے جیسا کہ آئندہ ہوا، یہاں مسلمانوں کا طرز بقوس مندروں کے مستوی (Trabeate) طرز کے پہلو بہ پہلو اور مقابلے میں اس طرح نمایاں ہے کہ بعض مصنفوں کو یہ کمان ہو گیا کہ ستون دار حصے قدیم چینی یا بدھی آثار کے ہیں، جن پر مسلمانوں نے قبضہ کر کے اپنے حسبِ فضا کام لے لیا ہے۔ مگر اصلیت یہ معلوم

لے سب سے پہلے یہ خیال برنیکل نے دیا اور پھر مورن اور اسکیئرنگ نے اسکو اختیار کر لیا۔ لیکن یہ کہ تیرہویں چودھویں صدی مسیوی میں جو پور میں بعض ہندو یا چینی عمارتیں موجود ہوں جن سے مسلمانوں نے کام لیا لیکن کم سے کم نوے فیصدی ستون ان مسجدوں کے اسی وقت بنائے گئے تھے جب لادھی جہاں موجود ہیں ان کے بھی کسی ضرورت پیش آئی ہو



ہوتی ہے کہ جس زمانے میں یہ مسجد بنی ہے، اس وقت تک یہاں کی اسلامی آبادی میں زیادہ تعداد نو مسلم مندوں کی تھی جو اپنی قدیم رسوم کی جہاں تک وہ نئے دین کے معارض نہ ہوں، پابندی کئے جاتے تھے۔ اور یہ تیب قریب یقینی ہے کہ یہاں کے مہاروں کی قدیم عادت و ذوق کا تقاضا ہی تھا کہ وہ نئے قومی طرز کی بجائے اپنی پہلی عمودی اشکال کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

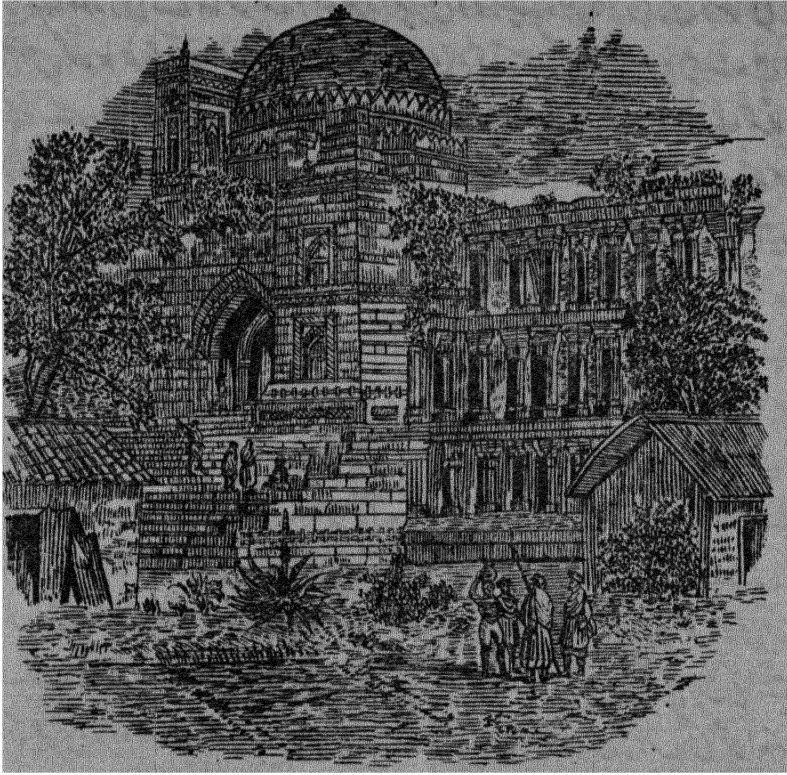
ہم اس قدر مطالعہ کر چکے کہ گور میں مہاروں کے پاس سوائے اینٹ کے دوسرا سالانہ تھا اور بغیر محراب بنائے بڑے دروازے تیار نہ ہو سکتے تھے، لہذا وہاں تو شروع سے مقوس طرز رائج رہا لیکن اس کے برخلاف احمد آباد میں جو لازماً ایک صحنی علاقہ تھا، اور وہاں پتھر کی کچھ کمی نہ تھی، ستون کی اوضاع اسی عمومیت کے ساتھ قائم ہوئی تھی۔ لیکن جس طرح جو پتھر میں بلکہ بہت مدت بعد تک یہی عملہ رائج رہا تھا کہ اس ملک (گجرات) کے سلطنت مغلیہ میں ختم ہونے سے پیشتر ہی مقوس اور عمودی طرز عمارت پوری طرح ایک دوسرے سے مکمل مل چکے تھے۔

جو پتھر میں سب سے قدیم مسجد تلے کے اندر فیروز شاہ تغلق کے سپہ سالار ابراہیم نائب بار بک کی تعمیر کردہ ہے جس کی تکمیل جیسا کہ ایک کتبے میں تحریر ہے، ۱۳۰۰ء میں ہوئی تھی بلکہ یہ شاید ۱۲۰۰ء میں اور کچھ بڑی مسجد نہیں ہے اور اس کے وسط میں صرف ایک عمارت ہے جس کی بڑی محراب، اس عہد کے عام اسلامی طرز کے مطابق، اور دونوں طرف پانچ پانچ درستونوں کے درمیان بنائے ہیں۔ ستونوں کے سامنے کی قطار دہری ہے اور ان میں سے باہر کے رخ کے ستون چوکور اور اندر کے گول ہیں جن پر بڑے تکلف کے نقش و نگار ہیں۔ ظاہر یہ کسی مندر ہے جو مسلمانوں کے بچنے سے قبل یہاں یا نواح میں تھا، لئے گئے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کل ستون ہمیں کام میں آگئے اور یہ ذخیرہ ختم ہو گیا کیونکہ بعد میں جو مساجد تعمیر ہوئیں ان میں ایسے ستون کہیں نہیں پائے جاتے بلکہ

۱۔ بلوچ میں یہ تاریخ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں (ردداد) شایک سوسائٹی ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) اور خیر الدین نے اپنی تاریخ جو پتھر میں جس کا پرگہ سن نے ترجمہ کیا ہے (صفحہ ۴۱) اسے ۱۰۰۰ھ بتایا ہے جو ۱۵۹۱ء کے مطابق ہو ۱۔ اس مسجد کی ایک تصویر کلکتہ کی انڈین آرکیٹیکچر میں اور نقشہ کلکتہ سیم کی رپورٹس

شہر میں اب تک تین بڑی مسجدیں سلامت ہیں ان میں سب سے مالیشان جامع مسجد ہے۔ جسے ابراہیم شاہ نے ۱۳۳۷ھ میں شروع کیا مگر تکمیل حسین شاہ شرقی کے عہد ۱۳۵۲ھ تک ۱۳۳۷ھ سے قبل نہ ہوئی۔ اسے سطح زمین سے ۱۶ تا ۲۰ فٹ کی بلند کرسی دے کر تعمیر کیا ہے۔ اندر ۲۱ فٹ ۴ x ۲۱ فٹ ۶ کا صحن ہے اور مغرب کی طرف مسجد کی صدر عمارت کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ وسط کے رقبے پر ۴ فٹ ۶ کے قطر کا ایک گنبد بنایا ہے جس کے سامنے قریب قریب مصری آثار اور نقشے کا ایک مخروطی دروازہ ۸۶ فٹ بلند ہے۔ اس برج نما دروازے کی بلندی نے ماذن کی ضرورت پوری کر دی ہے اور یوں بھی اذان کے لئے مینار کا ہونا جو نیوہ میں اسی قدر کم متداول ہے جس قدر کہ اسی زمانے میں دارالسلطنت دہلی میں اس کا رواج کم تھا یا نہ تھا۔ گنبد کے دونوں طرف ۲ فٹ ۷ x ۲۵ فٹ ۴ کے کمرے نکالے ہیں اور ستونوں پر پیچھڑکا فرش بنا کے انہیں دو منزلوں میں تقسیم کر دیا ہے جس کے آگے دونوں طرف پھر ۳۹ فٹ ۷ x ۴ فٹ ۳ کے کمرے ہیں جن پر چھلکی ہوئی قبہ نما چھت اس طرح بنا دی ہے کہ اس کا بالائی حصہ عمارت کی بیرونی سطح بن گیا ہے حالانکہ غوطی (Gothic) قبوں میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ان قبوں کی محرابیں نوکدار ہیں اور ان میں نیلے بنائے ہیں۔ ہر کمرے کی تختی دیوار میں تین تین محرابیں ہیں یعنی نیچے کے درجے میں کل پندرہ اور اوپر کے کمروں میں دو دو محرابیں ہیں۔ صحن کے تینوں رخ دہرے دالان بنے ہوئے تھے جن کی دو منزلیں صحن کی سطح کے اوپر اور ایک منزل نیچے تھی۔ ہر ایک میں نو نماور نکالے تھے جن میں سے جنوبی کی تصویر ذیل میں طرز عمارت کا خاصا اچھا اندازہ پیش کرتی ہے :

تصویر برصغور و بنگلہ

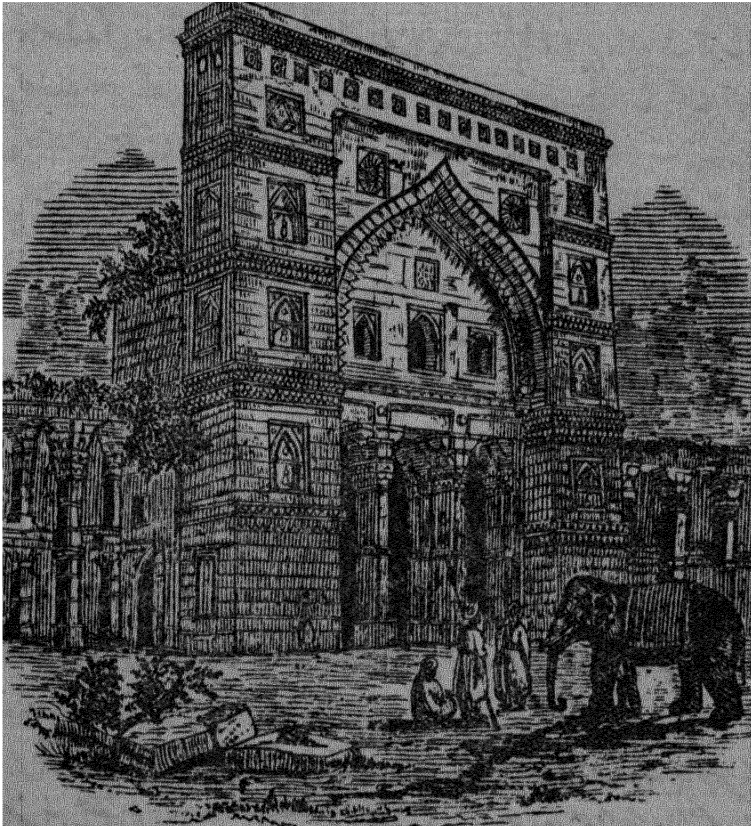


تصویر ۳۸۴ جامع مسجد جونپور کانجنوبی (مغلی) دروازہ

صحن کی مشرقی عمارت، اس طرف کا دروازہ اور دوسرے کمانچوں کی بالائی منزلوں کی نسبت مشہور ہے کہ سلطان سکندر لودھی نے حسین (علیہ السلام) کی کافر نعمتی سے بچنا کر انھیں منہدم کر دیا تھا اگرچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ بہت عرصے بعد اتاری گئیں۔  
شہر کی سب سے چھوٹی مسجد لال دروازے کی مسجد کہلاتی ہے جو شہر کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے۔ اس کا طرزِ دی ہے جو دوسری مسجدوں کا۔ اس کے دروازے کا پیش جس کی تصویر آگے آتی ہے ان عمارتوں سے زبردست آثار

لے شرقی آدلی نیچر ادون جونپور ۲۴ تا ۵۱ نیز دیکھو لوہیں ۲۶ تا ۲۷

نمونہ ہے اور اسی کے ساتھ ہندو مسلم طرز تعمیر کی وہ عجیب مخلوط وضع بھی دکھاتی ہے جو اس مخلوط طرز کے سارے زمانے میں مروج رہی مسجد کا طول ۶۸ فٹ ۱۶ اور سامنے سے لے کے عقب تک عرض ۳۵ فٹ ۴ ہے اور صحن ۱۲۲ فٹ ۲ شرفا غربا اور شمالاً جنوباً ۲۰ فٹ ہے۔ پہلوؤں پر کوئی ۱۶ فٹ عرض والا نئے ہوئے ہیں اور مشرقی سرے پر ان کا عرض ۱۶ فٹ رہ جاتا ہے۔ دروازے کے پیش کا کل عرض نیچے ۵ فٹ اور بلندی ۹ فٹ ہے تو



تصویر ۲۵۵ لال دروازے کی مسجد جوپور

جوپور میں جس قدر مسجدیں سلامت ہیں، ان میں سب سے مرصع اور خوبصورت



بنائے گئے ہیں اس میں استحکام کی ظاہری شان ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ اسلامی عمارات کا جو عام تخیل ہمارے ذہن میں ہے اس سے الگ ہے گو تعلق آباد اور بعض دوسرے مقامات میں یہ بات جو پور سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے ترک و افغان بادشاہوں میں استحکام کا اظہار طرز تعمیر کی ایسی ہی خصوصیت بن گیا تھا جیسا کہ انگلستان کے نارتھ بادشاہوں کی عمارات کا بھاری بھر کم مونا لیکن ہندوستان میں اس کے ساتھ جس درجہ نفاست پائی جاتی ہے وہ بہت کم کہیں ملے گی بلکہ دوسرے ملکوں میں تو استحکام اور عالی مہمتی کی عمارات میں غمو تا بعد اپن آگیا ہے اور یہاں یہ بات بالکل نہیں ہے۔

اس طرز کی خصوصیات پائے تخت جو پور ہی تک محدود نہیں بلکہ غازی پور اور جنوب میں قنوج تک ان کا اثر موجود ہے اور بتائیں میں بھی ان کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس شہر کی نواح میں بکریاں کٹنامی مقام پر ایک مجمعہ عہ مقابر ہے جہاں جس کا پہلے بھی تذکرہ کر چکے ہیں۔ ان کے پاسو بھی بعض اسلامی عمارتیں بنی ہوئی ہیں جو جو پور کے طرز تعمیر کا نہایت دلکش نمونہ اور یقیناً اسی زمانے کی ہیں، جس کی عمارات کا ہم نے اوپر حال لکھا ہے۔

مملکت جو پور میں بہت سے چھوٹے مقبرے اور خانقاہیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں مسلمانوں نے ہندو اور جینی ستونوں سے کام لیا اور محض ان کی ترتیب بدل دی ہے فن کے اعتبار سے یہ تفصیل و تنقید کے قابل نہیں لیکن ان میں ہر جگہ کچھ ایسی ناقابل بیان خوشنمائی ہے کہ یہ خواہی خواہی خراج تحسین وصول کر سکتی ہیں۔ اس مرکب طرز کا خاص نمونہ جو پور کی دہسجد ہے جسے عام لوگ "سیتا کی رسولی" کہتے ہیں۔ یہ ایک جینی مندر معلوم ہوتا ہے جس کی ترتیب اسی طرح بدل کے مسجد بنالیا گیا ہے۔

۱۔ اگر یہ عمارتیں اجمالاً یاد کے میں مل تک کے فاصلے پر ہوں جہاں میوں ایسی اور موجود ہیں، تو ان کا تذکرہ کچھ بھی ضروری نہ ہوتا، اور ہر شخص جو اس طرز عمارت سے واقف ہے ان کا زمانہ سن سکا یا کچھ پہلے یا بعد تبصر کر لیا اور بانی کا پتہ چلانے کی کوئی دیر دوسری نہ اٹھاتا کیونکہ اس عہد کی بہت سی دوسری عمارتیں اسی قسم کی پائی جاتی ہیں۔

جس طرح کہ ہم پہلے بعض عمارات کا ذکر کر آئے ہیں اسے آثارِ مسیت اس کی پائش ۱۳۳ x ۲۰ فٹ ہے۔ مسجد کی اصل عمارت میں ۱۵، ۱۵ استونوں کی ۴ قطاریں اور تین گنبد ہیں۔ پہلوؤں میں صرف دہرے دالان اور صدر عمارت کی نسبت ذرا چھوٹے ستون ہیں جن کی اصل تعداد ۶۸ تھی۔ باہر سے اس مسجد میں کوئی خاص خوبصورتی نہیں لیکن اندر کے ستونوں سے صحن مسجد میں عجیب و دلکش اور خوبی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے بڑے دروازے پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ابراہیم شاہ شرقی نے ۱۲۶۱ء میں مسجد کی صورت میں مکمل کرایا تھا بعد کے زمانے میں اور خود مختاری کے ہاتھ سے چلے جانے کے بعد بھی جو بنو راور اس کے توابع میں چند اعلیٰ درجے کی عمارتیں اسی عہد کے طرز تعمیر میں تیار ہوئیں لیکن ان کی اتنی اہمیت نہیں معلوم ہوتی کہ ایسی کتاب میں جیسی کہ ہماری ہے انکا تذکرہ ضروری ہو۔

۱۔ دیکھو کتاب ہذا صفحہ ۶۸، ۶۹، ۷۰

۲۔ کثافت ہم رپورٹس، جلد اول، ۲۸، اسی کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ صحن مسجد کے جو ستون ۱۲۶۱ء میں بنائے گئے تھے وہ ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل وہاں سے اٹھوائے گئے تھے۔

# باب پنجم

## گجرات

احمد آباد کی جامع مسجد اور دوسری مسجدیں۔ سرکھج اور پٹوا کے  
مقبرے اور مسجدیں۔ ضلّاع کی عمارات پر  
نشین

- منظرفشاہ والی گجرات ..... ۱۳۹۱ء  
اس کا پوتا احمد شاہ احمد آباد کی تعمیر کرتا ہے ..... ۱۴۱۱ء  
محمد شاہ حمیدل ..... ۱۴۲۱ء  
قطب الدین۔ رانا کبھ سے جنگ ..... ۱۴۵۴ء  
محمود شاہ بغزا ..... ۱۴۵۹ء  
منظرفشاہ ثانی ..... ۱۵۱۱ء  
بہادر شاہ مقتول (بہت پر تکیزاں) ..... ۱۵۳۶ء  
منظرفشاہ ثالث ..... ۱۵۶۱ء  
گجرات کا اسحاق اکبری سلطنت میں ..... ۱۵۶۲ء



ان میں غالباً سب سے نفیس احمد آباد کے طرز تعمیر کو سمجھا جائے گا اور اس کے سب سے زیادہ خاص ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ کوئی طرز اس درجہ ہندوستانی نہیں ہے اور کسی دوسرے طرز سے اس کی حقیقت اتنی قطعی طور پر واضح نہیں ہوتی جو جیسا کہ اور بیان ہوا، مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں سندھ و گجرات پر بڑی آن بان تھے ساتھ حملہ کیا اور بظاہر اسے بھی فتح کر لیا لیکن ملک آنا آباد اور اس کا تمدن ایسا اعلیٰ تھا کہ حملہ آور یہیں جذب ہو کر بہت جلد نظر سے غائب ہو گئے۔

اس کے بعد محمود غزنوی نے صوبہ گجرات پرورش کی لیکن کوئی مستقل نشان اپنا نہ چھوڑا اور سقوطِ دہلی (۱۱۹۶ء) کے بعد بھی گجرات اور ایک صدی تک اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتا رہا تا آنکہ سلطان علاء الدین خلجی نے اسے راجہ کرن و اگھیلہ سے جبین لیا اور اُسے صوبہ دار مقرر کئے۔ محمد شاہ ثالث تغلق نے ۱۲۹۱ء میں مظفر کو والی گجرات مقرر کیا جو تات قبیلے کا راجپوت نو مسلم تھا۔ اسی کے قریب زمانے میں تیموری حملہ نے ہندوستان میں مل جل ڈال دی۔ گجرات پہلے سبھی علما آزاد تھا مگر ۱۲۹۶ء میں مظفر نے باضابطہ خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ آئندہ دو صدیاں جن میں احمد شاہی مازدان سریراے سلطنت رہا ہمسایہ ریاستوں اور کشش باکڑاروں کے ساتھ مسلسل جنگ و جدال میں صرف ہوئیں لیکن مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہادر شاہ کی وفات (۱۵۲۶ء) تک ان کی طاقت بڑھتی رہی اگرچہ اپنی رعایا کے جذبہ تمرد کو وہ قطعی طور پر مغلوب نہیں کر سکے اور انکی بڑی تعداد گوانے دین کا پیرو تو یقیناً نہیں بنا سکے یہی سبب ہے کہ اس باب میں جن خاص خاص عمارتوں کا ذکر ہے، وہ یا اے محنت یا اس کے بالکل قریب وجہ کی ہیں۔ اس کے آگے نہ دوانے قدم مذہب قائم اور پہلے کی طرح مندر بناتے رہے گو ظاہر ہے کہ دھولکا، کھمبات، آبرو، وغیرہ

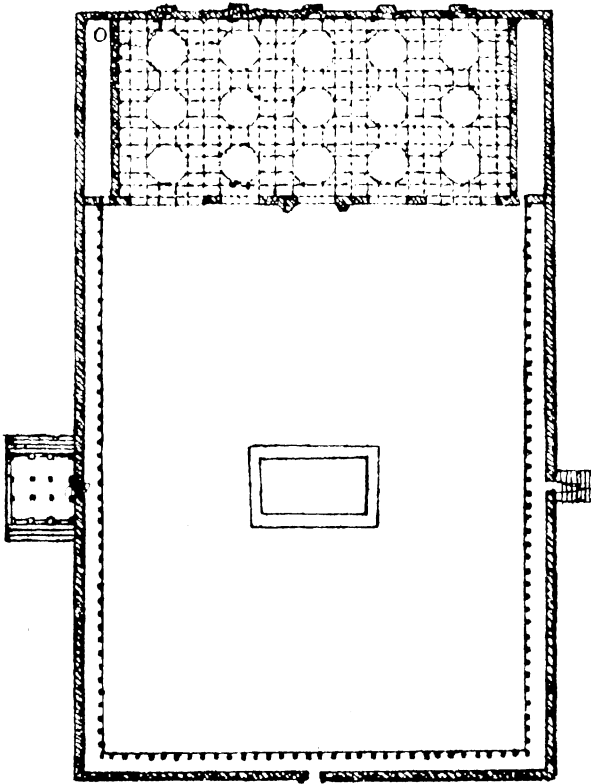
۱۔ گجرات میں عربوں نے مستقل طور پر کوئی حکومت نہیں قائم کی مگر سندھ میں ان کا تمدن اب تک غالب اور آبادی ۲ فیصدی مسلمان ہے۔ نو تعمیرم۔

بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے معبد موجود تھے جن میں سے بعض خاص وقت رکھتے ہیں اور انھیں عوام طور پر ہندو عمارتوں کے ستونوں کے بنایا ہے۔ خود احمد آباد میں ہندو اثرات آخر تک ساری ہیں مسجدیں تک خرمیات کے اعتبار سے بھی ہندووانی یا کہنا چاہئے کہ جینی وضع میں ہیں بلکہ کہیں کہیں کوئی محراب بنا دی ہے جس کی غرض یہ نہیں کہ وہ عمارت کے لئے ضروری تھی، بلکہ یہ ہے کہ ایک اسلامی نشان موجود رہے اور مقابر و محلات میں تو عام طور پر ایسی محرابیں بھی نادر ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ گجرات کی ہندو مملکت مسلمانوں کی فتح سے قبل تمدن کے بلند درجہ تک ترقی کر چکی تھی۔ سدھ پورا پٹن، بدھ پورا وغیرہ مقامات کی عمارتیں گجراتی نسل کی تعمیر کی قابلیت کو ظاہر کرتی ہیں مسلمانوں نے اس نسل کو جبراً مغلوب کیا لیکن اس نے اپنے فاضلین کو مغلوب اور مجبور کر دیا کہ وہ اوضاع اور فوہ اسباب ترجیح اختیار کریں جن سے بہتر فائدہ ان کے پس نہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے طرز عمارت میں جینی یا چالوکیہ صناعی کی نفاست و جلا کے ساتھ ایک خاص قسم کی وسعت و تنحیل شامل ہوئی جس تک ہندو کبھی نہ پہنچے اور جو اس قوم کی خصوصیت ہے جو انہوں نے تمام ہندوستان کو اپنے زیر نگیں لارہی تھی۔

اسلامی حکومت کا پہلا استقرار اہلوارہ تھا بولک گجرات کی پرانی راج دہانی اور مسلمانوں کے ہاتھ آنے کے وقت یقیناً ممالک ایشیا کے شاندار ترین شہروں میں داخل ہو گا۔ اس شان و شوکت کا اب بہت کم نشان باقی رہ گیا ہے۔ گجرات کے دوسرے بادشاہ احمد شاہ نے اہلوارہ سے مملکت بدل کے ایک مقام کرناوٹی میں منتقل کیا اور یہ جگہ اسی بانی شہر کے نام پر آئندہ احمد آباد موسوم ہوئی اسے ساتھی اپنی جلی مستعدی سے احمد شاہ نے عالی شان عمارتوں سے اس کی زیب و زینت بڑھائی۔ ان میں سب سے ممتاز جامع مسجد

لے مولف نے اس تمام بیان میں ضعف کا سا لڑکھا اور مسلمانوں سے اپنے عجیب و غریب کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ فقہ کی وسعت، تعمیر کی ادوار، مذہبی پھول گنبد وینار کے اٹھانے سے گجرات کی اسلامی عمارتوں میں جو نیا پایا جا رہا ہے، اس کا غیر اسلامی عمارت میں ملان لگان بھی نظر نہیں آتا۔ باوجود اس مسلمہ حقیقت کے فاضل مولف کو یا تو قریب کو صفت و بنا کی یہ فضیلت مسلمانوں سے چھین کر دوسروں کے حوالے کر دیا ہے۔ مقررہ۔

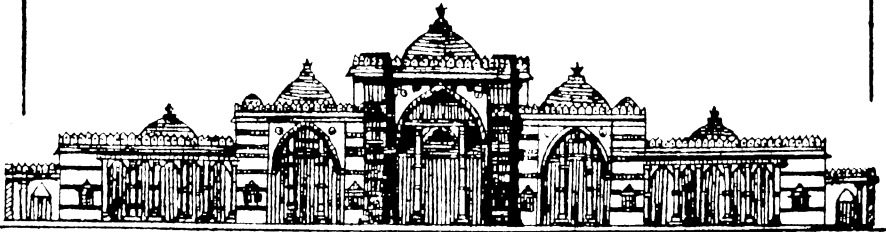
جو بہت بڑی تو نہیں لیکن مالک ایشیا کی سب سے خوب سے مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی ترتیب آئندہ نقشے سے واضح ہوگی اس کا طول ۳۸۲ اور عرض ۲۵۸ فیٹ ہے مگر اصل عمارت مسجد ۲۲۰ x ۹۵ فیٹ یعنی تقریباً ۲۰ ہزار مربع فیٹ پر بنی ہوئی ہے مسجد کے اندر ۲۶ ستون پندرہ گنبدوں کو اٹھائے ہوئے ہیں جن کو کمال تناسب کے ساتھ تعمیر کیا ہے اور صرف بیچ کے تین کچھ بڑے



نقشہ ۳۸۶

دوسروں سے خاصے زیادہ اوپر اٹھے ہوئے ہیں اگر اس نقشے کا راپور کے مندر سے مقابلہ کیا جائے جو قریب قریب اسی زمانے میں احمد آباد سے ایک سو ساٹھ میل کے اندر کنبھٹا نا کے زیر نگرانی تعمیر ہوا تو اس زمانے کی جینی اور اسلامی

ترتیب کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ ستونوں کی شکل اور عموماً جزئیات تقریباً دونوں عمارتوں میں یکساں ہیں گو مسجدوں کے ہاں زیادہ آرائش اور صناعی صرف کی گئی ہے مسجد کا نقشہ بھی مندر کی نسبت زیادہ سادہ اور یکساں چلا جاتا ہے اگرچہ گبنڈوں کی مختلف بلندیوں نے اس میں کچھ تنوع پیدا کر دیا ہے

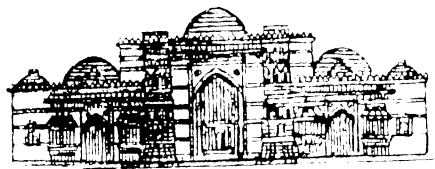


تصویر ۳۸۷

اور ہر ضلع کی کرسی عہد مختلف رکھی ہے میرا ذاتی احساس مندر کی شعریت کا ہمنوا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود مسجد کے نقشے میں جو سنجیدگی پائی جاتی ہے مگر یہ کہ وہ زیادہ تہذیب و فہم کی دلیل ہو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ دونوں نقشے ہزار ہا ستون کے جنوبی ایوانوں کی اُتھا دینے والی یکسانیت پر فوقیت رکھتے ہیں۔ یہ ایوان، وسعت اور محنت تعمیر کے اعتبار سے بے شبہ ممتاز نظر آتے ہیں لیکن سن تعمیر کیلئے ان کے علاوہ کچھ اور چیز بھی درکار ہوتی ہے جو پہلی تصویر سے عمارت کا عام نقشہ سمجھ میں آجائے گا لیکن انہوں نے اس کے مبارک ٹوٹے جڑے فوریس نے اس کا خاکہ لیا تو وہ سلامت تھے اور مشرقی روایتوں میں جس آباد کے لرزے میناروں کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔ ۱۸۱۹ء کے ایک زلزلے نے انہیں بالکل ہی لرزادیا۔ مگر شہر میں بعض اور مینار موجود ہیں جن سے ان کی

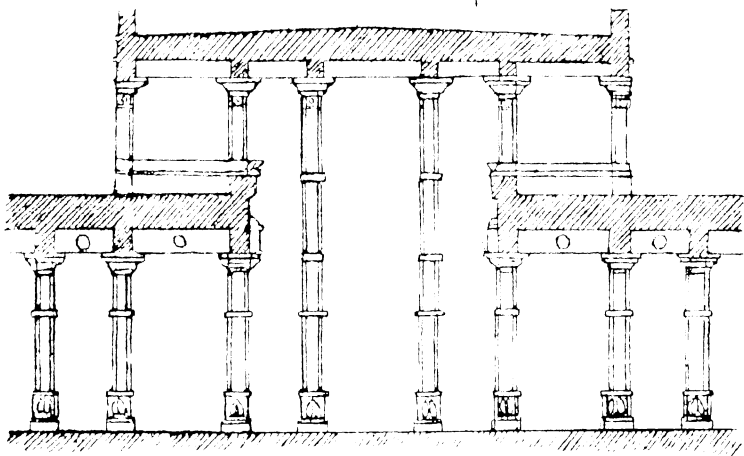
۱۸۱۹ء فوریس، اور نیل میمورائز۔ جلد سوم۔ باب سیم، نو یاد دیکھو آڑکی لوکل سروے آف ویسٹرن انڈیا، ہنرمم، ۲۰۔

شکل دوبارہ تیار کی جاسکتی ہے۔  
جامع مسجد کے پہلو اور نقشہ معمول کے خلاف ہیں ورنہ احمد آباد  
کی مسجدوں کی عام صورت وہ ہوتی تھی جو اپنی رُوب دہتی یا ”ملکہ کی مسجد“  
واقع محلہ میرزا پور کی ہے جس میں ۱۲، ۱۲ ستونوں پر تین گنبد ہیں اور وسطی گنبد اتنا اونچا  
رکھا ہے کہ اندر روشنی پہنچ سکے۔ اس کے نقشے کی تصویر کو سمجھانے کی غرض



تصویر ۲۸۹

سے ہم نے ایک اور شکل بنائی ہے جس سے اس کے گنبدوں کے ستونوں کی  
بلندی کا اندازہ ہوتا ہے کہ بیچ کے گنبد والے دوسروں سے دو گنے اونچے ہیں  
اوپر پر بھی چھوٹے چھوٹے ستون دے کے اس بلندی کو پورا کر دیا ہے۔ ان کے  
سامنے محراب جس کو غمام طور سے



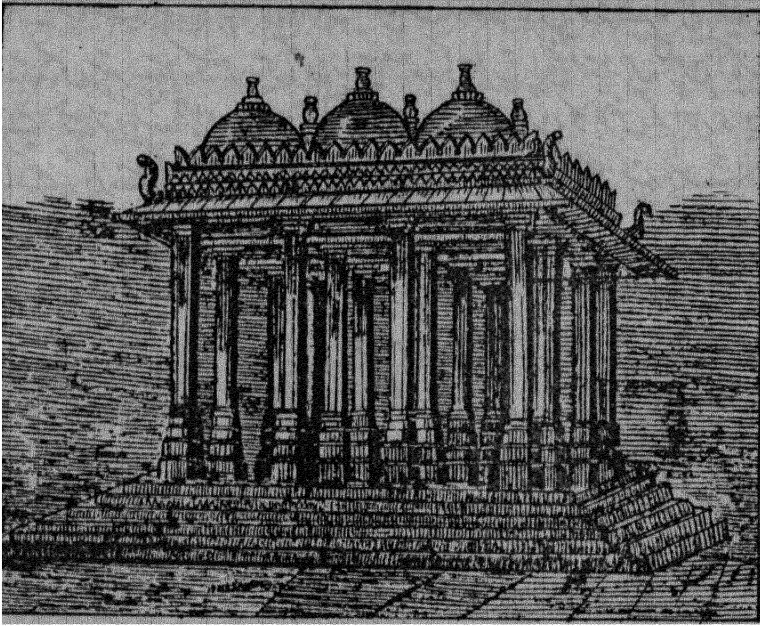
تصویر ۲۹۰

بڑے تکلف سے سنگ تراشی اور نقش و نگار سے آراستہ کرتے ہیں۔ اس

ترکیب سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کافی مقدار میں روشنی اندر آجاتی ہے جس طرح کہ باہمی شش زنگی گبنڈوں میں۔ فرنی اتنا ہے کہ یہاں باہمی زنگی گبنڈوں سے زیادہ صناعمی اور خوشنمائی پیدا ہوگئی ہے۔ سورج کی شعاعیں فرش تک بلکہ کھڑے آدمی کے سر تک نہیں پہنچ سکتیں بلکہ گبنڈ کی بیرونی چھت سے ان کی روشنی چھن کر اندر آتی ہے اور ہوا کے بہترین انتظام کے ساتھ عمارت بغیر خیرگی کے ایسی روشن رہتی ہے کہ دیکھے سے لطف آتا ہے پسب سے آخری خطرے سے بچاؤ کی فرض سے عموماً ان مسجدوں میں چھوٹے ستونوں کے آگے پتھر کی بہت باریک جالی لگا دیتے تھے۔ یہ اکثر اعلیٰ درجے کے کام کی اور نہایت خوبصورت ہوتی تھی، اسی لئے بار بار اڑالی جاتی تھی تو

مذکورہ بالا وضع کی تین یا چار مسجدیں احمد آباد میں بنی ہوئی ہیں لیکن تہہ رینج اس طرز میں مسند سی پن آتا گیا۔ اکثر اوقات سامنے کی محرابیں چھوڑ دی جاتیں اور صرف ستونوں کی قطار پر چھت ڈال دیتے جن کے گوشوں پر مینار ہوتے تھے۔ اس وضع کی سب سے بڑی ترقی شہر سے کوئی پانچ میل دور سرسبج میں نظر آتی ہے۔ ۱۲۶ء میں محمد شاہ نے یہاں اپنے باپ کے مشیر ویدیم اچنچ بخش کی یادگار میں ایک ۱۰۲ فیٹ مربع مقبرے کی بنا ڈالی۔ ان عمارتوں کی وضع کا اندازہ اگلی تصویر سے ہوگا جس میں مقبرے کے سامنے کی سولہ درمی دکھائی گئی ہے۔ اس میں حسب معمول نقشہ سیدھا سادہ ہے، کہ مربع، اوکھی کرسی، چوکور ستون جن میں سوائے اس کے کوئی تکلف نہیں ہے کہ پائے بتدیج چڑے ہوتے جاتے ہیں اور سرستون کو اوپر کے رخ پھیلا کے خفیف سا جھکاؤ دے دیا ہے۔

تصویر برصغیر دیگر



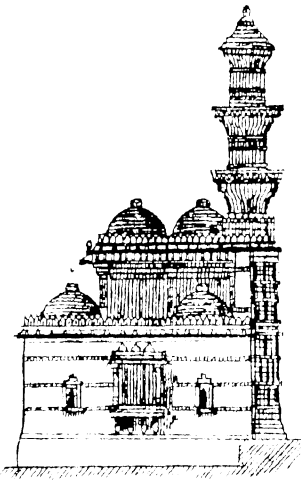
۲۲۵

تصویر ۳۹۲

اور پر نو چھوٹے چھوٹے گنبدوں کی چھت ہے جو بجائے خود کوئی وقت نہیں کھتے  
 لیکن اس قسم کی چھوٹی عمارتوں پر اندر سے دیکھئے یا باہر سے اس سے بہتر و  
 خوش وضع چھت ڈالنے کا طریقہ شکل سے کہیں نظر آئے گا تو اس مجموعہ عمارات  
 میں مسجد جو اندر سے ۱۲۱ x ۶۵ فٹ ہے اس میں تھیں کونچیں اور آخر میں  
 محمود بغزانے ایک مقبرہ ۴۷ مربع فٹ کا اپنے واسطے اور ایک اپنی بیوی  
 راجہ بانی کے واسطے تعمیر کرایا۔ ان کے ساتھ اور کئی مقبرے اور محل بنے ہوئے  
 ہیں اور یہ سب مل کر اس نواح کا سب سے اہم مجموعہ عمارات ہو گئے ہیں۔ ان میں  
 کہیں محراب سے کام نہیں لیا۔ ستون کی دیوار گمبوں کی وضع بھی مسترد ہے  
 اور گنبدوں کو عمودی اصول پر تعمیر کیا گیا ہے۔ بڑے مقبرے میں کوشش کی ہے  
 کہ دشمن کمرے سے زیادہ جگہ نکال کر بارہ ستونوں پر کلاں تر گنبد بنایا جائے  
 لیکن کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ دوازدہی شکل ساتھ کی عمارتوں سے

میل نہیں کھاتی اور اس کے لئے یا تو زیادہ وسیع جگہ چھوڑنی تھی یا بارہ سے زیادہ پہلو بنانے مناسب ہوتے۔ مسجد، البتہ، حسن سادہ کا کامل نمونہ اور جامع مسجد کے نقشے سے بھی بہتر ہے۔ اس میں بھی جامع مسجد کی طرح پانچ گنبد ہیں لیکن ایک دوسرے سے نزدیک تر اور باوجود مختصر زیادہ ہونے کے ان کا غرض کم اور دوگنا کار کھا ہے۔ اگرے کی موقی مسجد کے سوا جس کا ذکر آگئے آنے کا ہندوستان کی کوئی مسجد نفاست کے اعتبار سے اسی قابل دید نہیں ہے۔

ان بڑی مسجدوں کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی نہایت خوبصورت مسجدیں ہیں جن میں محافظ خاں اور رانی سیرجی کی مسجد سب سے ممتاز ہیں۔ پہلی کی صدر عمارت کا سرا جو ۱۷۹۲ء میں تکمیل کو پہنچا کچھ خوشنما نہیں لیکن اس کے اجڑا نہایت عمدہ ہیں اور حسن اتفاق سے اس کے مینار بھی سلامت رہ گئے ورنہ پڑا نی عمارتوں میں ایسا کم ہوتا ہے۔ پلو ذیل کی تصویر نیز جامع مسجد وغیرہ کی گزشتہ تصویر پہلے سے اندازہ ہو گا کہ ان میناروں کا پچھلا حصہ



تصویر ۳۹۳

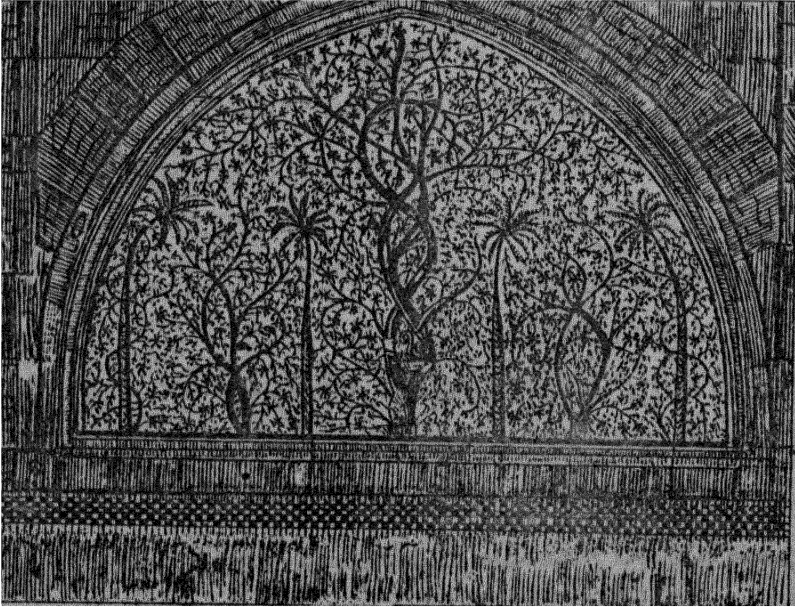
خالص ہندی وضع کا ہے۔ احمد آباد میں تمام پائے بالکل ہندو یا جینی مندروں کی کرسیوں کی مثل عمودی ہیں اگرچہ انہیں زیادہ لمبا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری اوضاع و خبریات بھی سب وہی ہیں جو چند تراوتی یا ابو (کی سند و عمارتوں) میں نظر آتی ہیں البتہ ایک فرق ضرور ہے کہ ہندو مندروں کے گوشوں میں طاق بنا کے موتیں رکھ دی جاتی ہیں ظاہر ہے کہ مسلمان اسے گوارا نہ کر سکتے تھے لہذا وہ ان میں بیل بوٹے کھنڈہ کرتے ہیں۔

سند گجرات کے تمام قدیم مینار یا گنبدوں کے کلس پتیل کا تہ ہوتا تھا لیکن تقریباً تیس سال ہوئے اس مسجد کی محکمہ تعمیرات نے مرمت کرائی تو اس کی بجائے ترقی پال بنادیا۔ حالانکہ اس مسجد کی تعمیر کے وقت شاید خود ترکوں نے اس نشان کو اختیار کیا ہو گا کیونکہ فتح استنبول کے بعد سے یہ نشان ان میں متوطن ہوا ہے۔

بقیہ صفحہ دیگر



جامع مسجد کے ابتدائی کوشش سے ے کے ملکہ کی مسجد (واقع مرزا پور) کے نفیس ترین نمونوں تک ہم اس وضع کے تدریجی ارتقا کا سائنہ کر سکتے ہیں۔ ایک صدی کی مشق سے انہوں نے جو جو شکلیں ایجاد کیں وہ تعمیرِ زیب و زینت کے اعتبار سے دنیا کے ہر ملک اور ہر زمانے کی اوضاعِ زیبائش سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اسی سلسلے میں یہاں کے مسلمانوں نے دیکھ کا وہی کی ایک نئی صنعت اختراع کی اور اس میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ ذیل کی تصویر میں سیدی شہ کی مسجد کے رتیچے



تصویر ۲۶۷

کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مسجد محل کے احاطے (بھدر) میں ہے اور اب توڑ کر خراب کر دی گئی ہے۔ تاہم اس تصویر سے صنعتِ مذکور کی باریکی اور خوشامی

بقیہ مائیں گزشتہ۔ اس مسجد کے تفصیلی حالات ”آرکیولوجیکل سروے آف ویٹرن انڈیا“ جلد ہفتم“ لوح ۹۷ تا ۱۰۴ میں تصاویر کے ساتھ کافی وضاحت سے درج ہیں۔

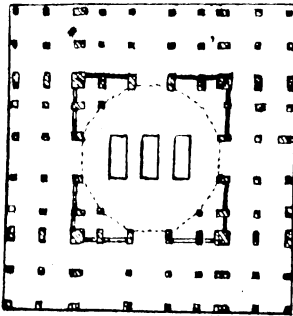
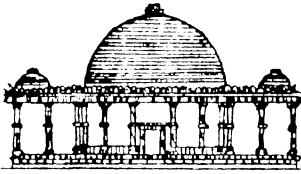
کا اندازہ ہو گا لیہ حق یہ ہے کہ جس ہندوئی سے اس میں باقی اشکال کو اسی حد تک باقاعدہ نقوش کی صورت میں مرتب کیا ہے جس حد تک یہاں ضرورت تھی اس سے بہتر صنائی کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ پھر جس طرح تین معمولی اور چار کھجور کے درختوں کو مساوی فصل دے کے تراشا ہے اس میں نہ منحصر قدرتی اشکال کی نقل ہے اور نہ ان میں سے پھول تے نکالنے کا اصل مقصد ہاتھ سے جانے دیا ہے پھر جس ہمواری کے ساتھ نقوش کو پوری سطح پر پھیلا یا ہے غالباً یہ سب سے بڑھ کر کمال کا نمونہ ہے۔ دہلی اور آگرے میں قیمتی مرمر تراشی کے بعض احوال نمونے ملتے ہیں لیکن اس صنائی کا وہ بھی پوری طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مسجدوں کی چھت پر مینار ہمیشہ گول اور قدرے مخروطی بنائے گئے ہیں جیسا کہ محافظاں کی مسجد کی تصویر میں دکھایا ہے۔ اور ان میں چھتے نکال کے تنوع پیدا کیا ہے۔ ان کی دیوار گیرہوں میں بڑے تکلف کا کام کیا ہے اور اسی طرح سنگدوروں میں جوان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اوپر کے سرے پر ہمیشہ مخروطی وضع کی برجی بنا دیے تھے اور اس میں بھی ٹیلریاں ڈالتے کہ ساٹا نہ معلوم ہوں۔ جہاں تک میسر علم ہے مساجد کے یہی مینار تعمیر کے حسن اور کاریگری کی باریکی میں قاہرہ کے میناروں سے فوقیت لے گئے ہیں۔ اور رانی سیپری کی مسجد کے مینار ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں حقیقت میں یہ مسجد احمد آباد بھر میں نقشے اور کاریگری دونوں کے لحاظ سے سب سے خوبصورت سمجھیں گے۔ اس میں محرابیں نہیں ہیں اور ہر حصہ ایسا بنایا ہے کہ ایک ہندوئی رانی ہی بنوا سکتی اور ہندوئی کاریگری تراش سکتے تھے۔

لے آکر لوکل ..... ویٹرن انڈیا، مضمون ۴  
 ۱۔ معمولی نقشوں سے ان مسجدوں کی خوبصورتی کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ناظرین کو چاہئے کہ  
 ”آرکھولوجیکل سروے آف ویٹرن انڈیا“ کی ساتویں صفحوں جلد کی تصویریں اور نقشے دیکھیں کہ  
 ان کی پچھراؤ احمد آباد وغیرہ (مطبوعہ ۱۹۶۶ء) کی تصویریں دیکھیں۔

## مقبرے

طرز تعمیر سے واقفیت ہو جانے کے بعد مقبروں کی وضع کا از خود اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان میں سب سے سادہ ابوتراب کا مقبرہ ہے۔ یہ بارہتوں پر ایک مشہد پہلو عمارت ہے جس کا ہر پہلو آگے تک بڑھا دیا ہے گرد بھی مربع بنا ہوا۔ دروازے چاروں پہلوؤں کے وسط میں ہیں۔ اس میں ادبیت ترتیب میں فرق یہ ہے کہ جہتی عمارات کے پہلو زاویہ دار ہوتے ہیں اور یہ مربع ہیں۔ اس میں ہندی وضع کی فوقیت ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتی ہے۔ اور اگرچہ ابوتراب کے چھوٹے سے مقبرے میں اس کی کھائی زیادہ گراں نہیں گزرتی لیکن سرکھینج کے مقبروں میں یہ بنائی کی حد تک پہنچ گئی ہے بجلیکے جہتی عمارتوں میں ستون کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں ایسا سمجھی نہیں ہوتا۔



تصویر ۳۹۶

مربع نقشے کی ناگوار کھائی کے علاوہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں سرکھینج میں محسوس کیا گیا کہ مشہد پہلو گن اپنے پانوں پر کچھ خوشنما نہیں تھا اس کی بہت کچھ صلیبیہ عثمان کے مقبرے میں کر دی گئی جسے محمود غزنائے ~~سلطنت~~ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس عمارت میں گنبد کے نیچے بارہ پہلو رکھے ہیں اور ستونوں کو دودھ اور چار چار کے مجموعوں میں نصب کرنے سے نیز بیچ میں کم دہشیں جگہ چھوڑنے سے خاصی طرح متنوع پیدا ہو گیا ہے نقشے میں گنبد نیچے

۲۳۹ کی منزل کے مقابلے میں بہت زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے لیکن مجموعی تناسب کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے اور جب وسطی چوک میں جالیاں بڑھائی گئیں تو احمد آباد کے ستونی طرز عمارت ہیں یہ مقبرے کی سب سے کامیاب قطع بن گیا۔  
اپنے عہد تعمیر کے آغاز زمانے میں احمد آباد کے مہار قوسی اوضاع کے بہت گردیدہ

نظر آتے ہیں جن سے دوسرے ملکوں میں ان کے بھائی عموماً کام لیتے تھے محمود غزنی کے ایک وزیر سیہ مہارک کے لئے سلسلہ میں جو مقبرہ محمود آباد میں بنایا گیا اس میں تمام ترقوی طرز سے کام لیا گیا ہے اور جیسا کہ آگے مفصل ہماری نظر سے گزرے گا، یہ ہندوستان کے سب سے عالیشان مقبروں میں شمار ہوتا ہے اسی بادشاہ نے احمد آباد کے قریب بٹوایں ایک بزرگ کے مزار پر مقبرہ تعمیر کرایا جو بہرخت بار سے اسی طرز میں ہے لیکن ہمارا محرابی ٹیکس بنانے میں ایسے نا تجربہ کار تھے کہ گو بڑی محرابوں کے سامنے چھوٹی محرابیں نکال کے نقشہ نہایت مناسب طور پر مرتب کیا لیکن یہ بیرونی سلسلہ یا تو بالکل منہدم ہو گیا اور یا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے تعمیر ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بہر حال یہ ساری عمارت بہت ہی بکڑی نوی صورت میں باقی ہے۔ حالانکہ اصل مقبرہ جس میں محرابوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا تھا چپہ گز کے فاصلے پر بالکل سلامت ہے۔ لیکن دونوں کے پمانے دیکھ کر یہ عجب کھل جاتا ہے کہ کس تعمیری ضرورت سے محراب کو تزجیح دیکھی تھی۔ اصل میں یہاں جتنے بڑے پائے اور وسیع تر فصل اور عرض و طول دینے مقصود تھے یہ بات اتنے بڑے پمانے پر صرف شہتیروں سے جن سے ہندو کام لینے کے عادی تھے، یسرا نہ کی جاسکتی تھی۔ یونانی اور رومی ان اوضاع سے اس لئے کام لیتے تھے کہ جتنی بڑی کمان بنانی ہو وہ عرض و طول ستونوں کے ذریعے مہیا ہو جاتا تھا۔ لیکن ہندو چھوٹے دائرے پر کام کرتے تھے اور بظاہر اسے بڑھانا ان کو نہ آتا تھا۔ اگرچہ یہ جادو یا ضروری ہے کہ ہندو عام طور پر ستونوں کو صرف صحن میں استعمال کرتے ہیں اور وہاں دیکھنے والے کی اپنی قیامت کے سوا اور کوئی چیز مقابلے میں نہیں ہوتی لہذا یہ ستون کافی بڑے نظر آسکتے ہیں لیکن جب مسلمانوں نے انھیں باہر کے رخ استعمال کرنا شروع کیا اور کمانیں اور دوسرے بڑے بڑے اجزایا رکئے تو اس وقت ان ہندو ستونوں کا چھوٹا ہونا نمایاں ہو گیا تو

ممکن ہے کہ صرف دست اور طول و عرض کو تعمیر کا مقصد قرار دینا، عہد انحطاط کی دلیل مانا جائے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ مقصد صنعت تعمیر کا ایک بڑا اور اہم جزو ہے اور احمد آباد کے متاخرین ایسا ہی خیال کرتے تھے۔ بعد کی مساجد و عمارتوں میں انھوں نے بڑی دست و رفعت پیدا کی مگر ان تمام اوصاف کو ہاتھ سے دے بیٹھے جن کی بدولت ان کا ابتدائی طرز اس قدر خوبصورت اور دلچسپ تھا کہ

مذکورہ بالا عمارات کے علاوہ احمد آباد میں صنّاعی کے بعض خود تر نمونے بھی غیر معمولی طور پر خوبصورت ہیں۔ ان میں چند بادلیاں اور وایا گھرے کوئیں قابل ذکر ہیں جن کی تہ تک چوڑے چوڑے زینے بنائے ہیں اور ستونوں اور غلام گردشوں سے اسی اہتمام کیساتھ آراستہ کیا ہے۔ جیسے زمین کے اوپر بعض ٹری ٹری عمارتوں کو مغرب والوں کی نظر میں جہاں بارش کی کثرت ہے، پانی کی کون قدر کرتا ہے لیکن گرم ملک کے نمٹنے والے ان زیر زمین مکانوں کی راحت بخش ٹھنڈک میں خود آئیں تو لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شہر کے گرد بہت سے بڑے بڑے تالاب ہیں اور ان میں پانی کی آمد برآمد کے جو بند بنائے ہیں وہ بھی حسن تعمیر کا ایک نمونہ ہیں لہذا ان منفید عمارتوں کی جیڑوں ہی کے طرز سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل احمد آباد تعمیر کا کیسا طبعی ذوق رکھتے تھے۔ یہ ان کی فطرت کا تلقاض تھا کہ ہر شے خوبصورت و پر تکلف بنائی جائے اور وہ ان چیزوں میں بھی ایسے ہی کامیاب ہوئے جیسے اپنی مساجد و محلات کی تعمیر میں ۶

۲۴۱

## اضلاع کی عمارتیں

پائے تخت احمد آباد کی متعدد عمارات کے علاوہ، ولایات گجرات یا اضلاع کے صدر مقامات میں بھی جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، بعض قابل ذکر عمارتیں ہیں۔ ان میں کھمبات کی جامع مسجد نہایت عالیشان ہے یہ محمد غفلت کے زمانے (۱۷۲۵ء) میں تعمیر ہوئی اور وسعت میں صرف پائے تخت کی مسجد سے کمتر ہے۔ اس کا پورا رقبہ ۲۰۰ × ۲۱۰ فٹ اور اندر کا صحن ۱۲۰ × ۱۳۵ فٹ ہے۔

۱۔ احمد آباد یا قرب و جوار کے ان دادوں کی بالتصویر کیفیت کے لئے ملاحظہ ہو اگر کوئی محل سرورے اورن دیٹرن انڈیا، جلد ششم، ہشتم، نہم ۶

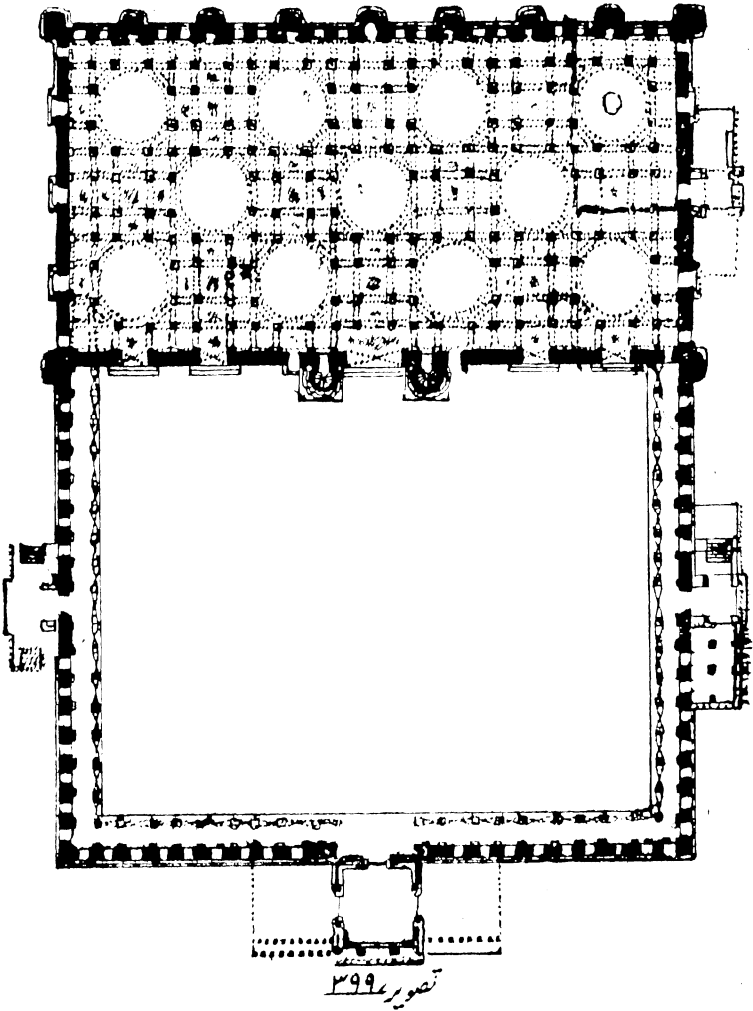
التمش کی مسجد اجیر سے یہ قدرے چھوٹی ہے ورنہ نقشہ اور ترتیب قریب قریب وہی ہے لیکن اندر جا کے تفصیل سے دیکھئے تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا کھمبائت کے صدر والاں کی کانیں جو تعداد میں صرف تین ہیں بالکل سادہ بلکہ سپاٹ اور اتنی نیچی رکھی ہیں کہ اندر کے مہندی یا جینی ستونوں کی لمبائی کے موافق رہیں جو سب کے سب شکستہ مندروں سے جیسا کئے ہیں اور کم سے کم اس جگہ مناسبیت یا تعمیری خوشنماہی کا لحاظ کئے بغیر انہیں از سر نو نصب کر دیا ہے۔ بائیں سہان میں ایک خاص حسن پیدا ہو گیا ہے اور جملہ عناصر اپنی غرض کے موافق چٹیک جائے پر ہونے کے باعث نکوئی ناگوار عدم مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اس مسجد کی سب سے قابل دید عمارت، بانی مسجد عمر ابن احمد کا زردنی کا مقبرہ ہے جو اس نے ۱۲۲۲ء میں خود بنوایا تھا۔ یہ صحن کے جنوبی سرے پر کوئی ۲۹ فٹ کے عرض میں، دو منزلہ بنا ہوا ہے اور اس پر ۲۷ فٹ قطر کا گنبد ہے۔ اس میں سب ملبہ بظاہر ہندو عمارتوں کے کھنڈروں کا ہے، اسی لئے مختلف اجزا ایسی بری طرح جمانے لگے تھے کہ تین صدی بعد یہ عمارت گر پڑی اور اس وقت سے کھنڈر پڑی ہوئی ہے۔ شکل کے اعتبار سے یہ حد درجہ خوشنما اور صنّاعی کے لحاظ سے بہترین شے تھی لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا مصالحہ جو دوسری چیزوں کے لئے تیار ہوا تھا، کسی اور مقام پر استعمال کرنا کس قدر حماقت کی بات ہے۔ اسی نقشے سے ملتی جلتی مگر عرض و طول میں کم، ایک مسجد بڑی میں ہے۔ اس کا پورا طول ۱۲۵ فٹ ہے اور کم سے کم آج کل کسی بیرونی احاطے کے آثار نہیں پائے جاتے مگر اس میں بعض صنّاعی کے نمونے بہت خوبصورت ہیں۔ احمد آباد سے بمیل جنوب مشرق میں چمپانیر واقع ہے جسے محمود لہزار نے ۱۲۸۷ء میں فتح کر کے اپنا پائے تخت بنایا۔ یہاں اس نے

۱۔ کھمبائت کی مسجد کے حالات اور نقشوں کے واسطے ملاحظہ ہو آرکیوولوجکل سروے  
۔۔۔۔۔ انڈیا جلد چہارم، ۲۔

## ایک مسجد جامع تعمیر کی

۲۲۲



جو سنہ ۱۰۰۰ میں مکمل کو پہنچی اور فن کے اعتبار سے خاصی طرح عجرات کی ہے  
 خوبصورت عمارت سمجھی جاسکتی ہے۔  
 باہر سے اس کا طول شرقاً ۲۱۶ اور شمالاً جنوباً ۷۸ فٹ ہے صحن کے  
 تینوں پہلوؤں پر کھلے ہوئے دالان (اب نہایت شکستہ) ہیں اور شمال جنوب

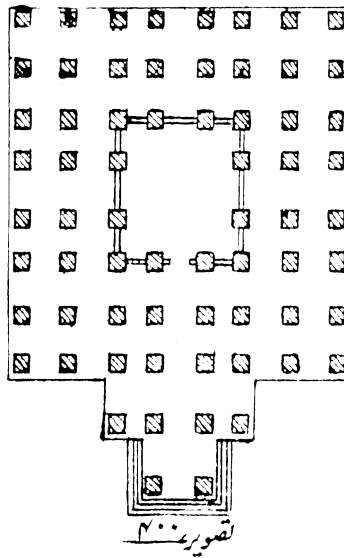
اور مشرق کی طرف آمد و رفت کے دروازے ہیں جن میں پہلے دو چھوٹے اور مشرق کی طرف صدر دروازہ زیادہ بڑا بنایا ہے اور اس پر بڑے اہتمام سے سنگ تراشی کا کام کیا ہے۔ اصل مسجد کافی بڑی اور بھی تک خاصی درست حالت میں ہے۔ اندر سے اس کی پیمائش  $\frac{1}{2} \times 169$  فٹ ہے اور احمد آباد کی جامع مسجد کی طرح اس میں بھی گنبدوں کی تین قطاریں ہیں مگر ان کی ترتیب بالکل مختلف ہے جیسا کہ گزشتہ تصویر سے معلوم ہو گا، یہاں چار گنبد اگلی اور چار پچھلی قطاریں اور وسطی قطار میں صرف تین ہیں مگر انہیں اس طرح بنایا ہے کہ تین آڑی قطاریں بن گئی ہیں۔ اس عجیب ترتیب سے ان گیارہ گنبدوں کے نیچے جن میں سے ہر ایک کا قطر  $\frac{1}{2} \times 20$  فٹ ہے بمغربی دیوار میں ۷ قبلے یا محرابیں بنائی ہیں اور باہر کے رخ پانچ درمیں جن میں وسطی کی مکانات حسب معمول بغلی محرابوں سے بہت اونچی اور گنتی چوڑی ہے۔ اس کے دونوں رخ سو سو فٹ اونچے مینار ہیں اور سامنے کی منڈیر جو ۱۵ فٹ تک چلی گئی ہے، ۵۰ فٹ کے قریب بلند ہے۔ اسی کے عقب میں وسطی گنبد تین منزلیں دے کر تعمیر کیا ہے اور ہر منزل میں دو غلام گردش چھوڑی ہیں مسجد کے چاروں گوشوں پر ۵۰، ۵۰ فٹ اونچے چار دمے بنائے ہیں جن پر چھت کی سطح تک نقش و نگار ہیں مگر اوپر کا حصہ سادہ بلکہ کسی قدر گنوار و معلوم ہوتا ہے کہ

احمد آباد سے ۳ میل جنوب مغرب میں ڈھتھو لکے کی دو مسجدیں بہت خوبصورت ہیں۔ ان میں سے ایک ہلال خاں قاضی کی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ اندر سے شمالاً جنوباً ۱۴۲ اور طول میں ۱۴۴ فٹ ہے جس میں مسجد کی ۲۵ فٹ لمبائی اصل عمارت بھی داخل ہے۔ اس کے سامنے کے رخ اونچے حصے میں تین وسطی کمائیں اور بازوؤں میں ایک ایک جالی کی کھڑکی آمد و رفت کے لئے بنی ہوئی ہے۔ اوپر دو چھوٹی چھوٹی برجیاں بنا دی ہیں۔ اندر سنگ مرمر کا نفیس منبر اور چوکو بچھروں کی (جو مہند و مندروں سے لئے نکلے ہیں) خوشنما چھت ہے۔ صحن کے رخ بہت نفیس لکھنچہ بنا کے صدر دروازہ تعمیر کیا ہے جسے بنا سلسلہ ہے کہ دوسری جامع مسجد ہے جس کا طول اندر سے شمالاً جنوباً ۱۴۲ فٹ ہے۔



اس پر بھی پانچ گنبد بنے ہوئے ہیں۔ تین وسط میں اور ایک پہلوؤں پر۔  
 احمد آباد کی مسجد کی مثال اس کی وسطی گمان کے دونوں طرف بھی مینار بنائے ہیں۔ یہ  
 مسجد شاہ جہاں میں تعمیر ہوئی ہے۔  
 تیسری مسجد جو تمام تر مندروں کے لیے سے بنی ہے اسلئے میں مکمل کو پہنچی اور  
 مانگا مسجد کہلاتی ہے۔

مگر اضلاع کی ان عمارتوں میں سب سے خوبصورت قصبہ محمود آباد کا مقبرہ ہے جو  
 ہندوستان بھر میں اس قسم کی سب سے اچھی عمارتوں میں داخل ہے اسے محمود بنزل نے  
 اپنے ایک وزیر بابرک سید کے واسطے شاہ جہاں میں تعمیر کیا تھا۔



اسی بادشاہ کے زمانے میں قطب عالم کا مقبرہ بنوا میں تعمیر ہوا جس کا ادھر  
 ذکر آچکا ہے مگر متارک سید کا مقبرہ اگرچہ اس سے چھوٹا اور دروازے کو چھوڑ کر  
 لے ان تینوں مسجدوں کے تفصیلی حالات اگر کوئی جملہ سروے... میں مذکور ہیں۔

۹۶ مربع فٹ سے، لیکن نقشے کی سادگی، اجزاء کے استحکام و تناسب کے اعتبار سے زیادہ بہتر نمونہ پیش کرتا ہے اور اس لحاظ سے ہندوستان کا کم کوئی مقبرہ اس سے فوقیت رکھتا ہو گا۔ اس نقش و نگار بھی نہایت نفیس اور مناسب موقع تیار کئے ہیں اور مجموعی طور پر مقبروں میں سب سے اول صف میں جگہ پانے کیلئے صرف عرض و طول کی کمی ہے ورنہ تعمیری ترتیب میں بھی اگر سیما نہ بڑھا دیا جائے تو کسی رد و بدل کی گنجائش بنانے والے نے نہیں چھوڑی ہے تو قبر کے گرد بہترین نقش و نگار کا محجربا ہوا ہے اور دُہرے سائبانوں سے حلیۂ قبر میں اس عزت و سکون کی شان پیدا ہوئی ہے جو ایسے مقابر کی نہایت ضروری شرط ہے۔

لے گجرات کے اسلامی آثار قدیمہ کے تفصیلی حالات کے لئے وہی کتاب آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا (جلد ششم تا نہم) قابل ملاحظہ ہے جس کا ہم اس باب میں جاہ باعوالہ دیتے رہے ہیں تو

# باب ششم

مالوہ

دھار۔ منڈو کی بڑی مسجد۔ محلات۔

سین

سلطان دلاور غوری	۱۴۰۱ء
سلطان ہوشنگ	۱۴۰۵ء
محمد غرانی خاں	۱۴۳۴ء
محمود شاہ خلجی (مہمصر اناکبھہ چٹوڑی)	۱۴۳۶ء
سلطان غیاث شاہ خلجی	۱۴۶۵ء
سلطان ناصر شاہ	۱۵۰۰ء
سلطان محمود ثانی	۱۵۱۰ء
مالوے کا اسحاق سلطنت گجرات میں	۱۵۳۰ء
منلیہ میں	۱۵۶۹ء

منڈو کے غوری خاندان نے جو نور کے شرقیوں کے ساتھ ساتھ خود مختاری حاصل کی یعنی سلطان دلاور نے جو ۱۴۰۱ء سے صوبہ مالوہ میں حکومت کرتا تھا، اس میں شاہ کا لقب اختیار کر لیا لیکن منڈو کی عظمت اور تمام بہترین عمارات بنانے کا فخر ہوشنگ کو حاصل ہے اس کے بعد دوسری اسلامی حکومتوں کی طرح یہ بادشاہی بھی

کچھ مدت پہلے ہی چھوٹی رہی تا آخر سلسلہ میں سلاطین ہجرات نے اور آخر میں اکبر نے فتح کر کے اسے ۱۶۹۰ء میں اپنی سلطنت کا جزو بنالیا۔  
 اس مملکت کا پہلا صدر مقام دھارم تھا، جو منڈو سے کوئی ۴۰ میل شمال میں قدیم شہر تھا مگر خود مختاری کے بعد منڈو کو دارالملک بنا لیا گیا۔ منڈو کے قدیم اور محترم شہر ہونے کے باوجود دھارم اس کی گزشتہ عظمت کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی مسلمانوں کی بھی صرف دو مسجدیں ہیں جن میں تمام تر ہندی عمارات کے کمندروں کا مصالحہ استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں بڑی مسجد جامع ہے اس کے صحن کا عرض شمالاً جنوباً ۲۰۰ فٹ اور طول ۱۳۱ فٹ مے مسجد کی اصل عمارت ۱۱۹ x ۱۰۰ فٹ میں بنی ہوئی ہے جس کی چھت ۴۰ ستونوں پر قائم ہے یہ صرف ۱۲۰ فٹ بلند اور ہندی فن تعمیر کی یادگار ہیں اور سب پر کم و بیش برتکلف سنگ تراشی کا کام ہے مسجد کا سامان زینت سنگین ہیں مگر ان کا طرز بھی ہندی ہے صحن کے ہر طرف والاں چلا گیا ہے جس میں ۴۸ ستون ہیں۔ ان کی بلندی صرف ۱۰ فٹ ہے مگر ان پر بھی بہت اہتمام سے بیل بوندے تراشی میں قطب صاحب یا اجیر کی مسجد کی مثل یہاں محرابیں دے کے کوئی دیوار سامنے نہیں بنائی۔ اندر سوائے ہندی ستونوں کے اور کوئی چیز نمایاں نہیں ہے۔ اور جانب مغرب نماز کی محرابیں یا مسجد کی ترتیب نہ ہو تو یہ ایک ہندو عمارت سمجھی جاسکتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ یہاں کوئی چیز قدیم سے اپنی جگہ پر نہیں ہے بلکہ یہ ستون بستی کے ٹکڑے مندروں سے مسلمانوں ہی نے لاکے یہاں لگائے ہیں جہاں وہ اب تک قائم ہیں اور غالباً یہ تعمیر منڈو میں پائے تخت کے منتقل ہونے سے قبل مکمل کو پہنچی تھی۔  
 دوسری مسجد بھی اسی قسم کی اور قدرے چھوٹی ہے مگر مدت سے یہاں نماز وغیرہ نہیں ہوتی اور بہت ہی بے مرمت حالت میں پڑی ہوئی ہے اس کے دروازے کے سامنے لوہے کا ایک کھمبا زمین میں آدھا دبایا پڑا ہے اور اسی کے نام پر اسے لاکھ مسجد کہتے ہیں بعض اوقات اسے بھی قطب کے منار کی طرح منار فتح (جے استعبا) کہا گیا ہے لیکن یہ قیاس شکل سے درست ہو سکتا ہے۔

اگر یہ محض زیب و زینت کے لئے ہوتا تو اسے مدور یا مشمن اور خوش خض بنو چاہئے تھا۔ لیکن اب یہ جن تین ٹکڑوں میں بٹا پڑا ہے ان میں سب سے بڑا ٹکڑا ۲۴ فٹ ۳ اور اس کا آخری حصہ ۱۱ انچ کے قریب تک چوکور ہے نیچے کے رخ کوئی دو فٹ کی جگہ چھوڑ کر بھی اسے چوکور بنایا ہے۔ دوسرا ٹکڑا ۱۱ فٹ ۱۱ انچ لمبا اور تین چوتھائی کے قریب چوکور اور باقی مشنت پہلو ہے۔ تیسرے ٹکڑے کی پائش ۱۱ فٹ اور یہ سرے کی گول پٹی کے سوا باقی مشمن ہے۔ یہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ اڑواڑ وغیرہ کسی عمارتی کام کے واسطے بنا تھا جیسے کنارک میں سورج کے مندر کی مصنوعی چھت کے لئے اس طرح کی اڑواڑ کا ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں ذکر کر چکے ہیں۔ اس لاکھ میں بعض سوراخ موجود ہیں جن سے اس قیاس کی کسی حد تک تائید ہوتی ہے۔ بہر حال اصلیت جو کچھ بھی ہو، یہ اس بات کا ایک اور عجیب ثبوت ہے کہ اہل ہند اس زمانے میں جب کہ ہم انھیں اس قسم کے آلات بنانے کی قابلیت سے معری سمجھتے ہیں، لوہے کے اتنے بڑے بڑے ٹکڑوں سے کام لیا کرتے تھے۔ بس لاکھ کی تیاری کا زمانہ غالباً وہی ہے جب کہ اس مسجد کے جہاں یہ بڑی ہومی ہے ستون بنائے گئے ہوں گے اور ان ستونوں کی طرز سے پایا جاتا ہے کہ غالباً وہ دسویں یا گیارھویں صدی کے ساختہ ہیں۔

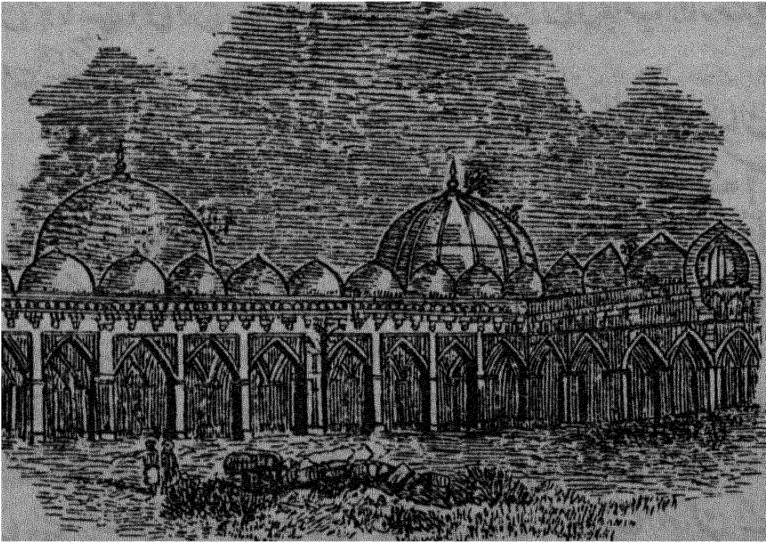
وہ مقام جہاں شہر مند واقع ہے سندوستان کے صدر مقامات کے بہترین محل وقوع میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک وسیع سطح مرتفع ہے جسے ایک گہری گھٹائی نے مالوے کی عام سرزمین سے الگ کر دیا ہے۔ یہ گھٹائی گہرے کم بھی ۳ سو ۴ سو گز چوڑی ہے اور ۲ سو فٹ سے کسی جگہ گہرائی میں کم نہیں۔ اسے عبور کرنے کے لئے نہایت عمدہ پشتہ بنا ہوا ہے جس کی حفاظت تین بڑے دروازوں سے ہوتی ہے اور پستے کے دونوں طرف مقابر ہیں۔ اس ٹیکرے کے گرد جہاں شہر بستا ہے اور چٹان کے عین کنارے پر شہرناہ بنائی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دور میں ۲۸ میل تک چلی جاتی ہے۔ لیکن اس سے شہر کی

دست کا بہت غلط اندازہ ہوتا ہے جب تک یہ صراحت نہ کر دی جائے کہ یہ دروازہ جہاں کہیں ممکن ہو اٹھائیوں کے بلند حصے سے ملا دی گئی ہے اور بعض جگہ یہ گھٹائیں ایک ایک دو دو میل تک ٹیکرے کے اندر چلی گئی ہیں اور ان کے درمیان میں صرف نصف میل کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ سارے ٹیکرے یا سطح مرتفع کا طول بھی شرقاً غرباً ۴ میل اور شمالاً جنوباً ۳ میل ہو گا۔ اس کی بالائی سطح میں نہایت دلکش نشیب و فراز پائے جاتے ہیں اور پانی کی افراط ہے زمین اتنا درجے کی زرخیز ہے جیسا کہ خود رو و درختوں سے ظاہر ہے جن کی کثرت نے شہر کی عمارتوں کے ٹکڑے کر دیئے یا انہیں اس طرح ڈھانک لیا تھا کہ چند روز پہلے تک وہ مشکل سے نظر آتی تھیں۔

فیصل کے شمال کا راستہ دہلی دروازے سے ہے جو اب نہایت شکستہ ہونے کے باوجود بلند و بالا دکھنے کے قابل عمارت ہے۔ یہ خالص پنجاب طرز میں ہے لیکن تناسب اجزا اور لوازم زیب و زینت کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر سفینے پر شہر کے اندر سب سے عمدہ عمارت مسجد جامع ہے جسے دوسرے بادشاہ ہوشنگ شاہ (۱۵۰۵ء تا ۱۵۲۵ء) نے شروع کیا تھا مگر ۱۵۵۵ء میں محمود شاہ اول اتمام کو پہنچا سکا۔ یہ بہت بڑی نہیں ہے مگر بھی سادہ مناعی اور عظمت کے باعث اپنی قسم کی عمارتوں کی نصف اول میں شمار ہوتی ہے۔ باہر سے اس کی پیمائش شمالاً جنوباً ۱۲۰ فٹ اور شرقاً غرباً ۲۹ فٹ ہے جس میں ۵۵ فٹ آگے نکلا ہوا دروازہ یا کمانچہ شامل نہیں ہے۔ اندر سے ۱۶۲ فٹ کا قریب قریب بالکل مربع صحن ہے اور اس لحاظ سے اس کے چاروں رخ بھی یکساں ہیں کہ ہر پہلو میں مساوی عرض و رفعت کی گیارہ بڑی بڑی کمانیں بنی ہوئی ہیں جن کے نیچے دس فٹ لمبہ بھر بھرے پتھر کی ایک ہی ڈال کے پائے یا ستون دیئے ہیں۔ اگر کچھ تنوع ہے تو اتنا کہ مشرق کی طرف دوہرا اور شمال و جنوب میں تہرے والاں ہیں اور صد قبائلی عمارت پانچ گہ کی بنائی ہے اور ۴۲، ۴۲ فٹ قطر کے تین گنبد بھی اسی طرف ہیں۔ ان بڑے گنبدوں کے نیچے بارہ بارہ ستون مساوی فاصلہ پر نصب کئے ہیں۔ اور سمار نے یکسانی کی خاطر وسطی چوک کو بھی جس کے اوپر گنبد کا خطہ تقاطع قائم

کیا ہے، زیادہ چوڑا نہیں کیا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ شمس کے وہ چار پہلو جن پر گنبد ہے اور جو صحن کی سمتوں کے بالمقابل ہیں، باقی آڑ سے چار پہلوؤں سے قدرے چھوٹے ہیں۔ اندرونی طور پر یہ بہت بے ڈھنگی شکل ہو جاتی ہے لیکن اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ایک دوسری دشواری یہ پیدا ہو جاتی کہ چھوٹے گنبد جن چھوٹی محرابی قطاروں پر قائم کرتے پڑے ہوں گے ان کے اور زیادہ عوامی کمانوں کی قطاروں کے مقام اتصال پر تسطیل فصل چھوڑنے پڑتے اور اسی لئے غالباً معمار نے ان دونوں میں سے کمتر زحمت کی شکل اختیار کی ہے۔

اندرون صحن کی تصویر ذیل میں دکھائی گئی ہے اور استحکام و عظمت کے سادہ اظہار کے شاید بہترین نمونے جو اس وقت ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، اس مسجد کا بھی انہی میں شمار ہے۔



تصویر نمبر ۳۰۳

یہ بہت شکستہ ہوتی جاتی تھی لیکن چند سال ہوئے ریاست دہلی کی طرف سے اس کی اور مرمت کے دوسرے آثار قدیمہ کی بہت کچھ مرمت کرائی گئی ہے۔

مسجد کے عقب میں بانی کا مقبرہ، اگرچہ کچھ بہت بڑا نہیں ہے مگر ایک جگہ جو سٹھان بادشاہ کی آخری منزل ہونے کے اعتبار سے اس میں ایک خاص عظمت و شان پائی جاتی ہے۔ اندر باہر سنگ مرمر کی پچھکاری محض خوبصورتی کے لئے کی گئی تھی اور چونکہ یہ تعمیر عمارت کا اصل جزو نہ تھا، لہذا جگہ جگہ سے نکل گیا ہے۔ دروازے سے اور اس کے پہلو کے دو دریکوں سے روشنی اندر آتی ہے شمال کی طرف تین سنگ مرمر کی جالیوں سے بھی روشنی چھتی ہے جس کی وجہ سے اندر کا حصہ صرف اسی قدر تاریک ہے جتنا کہ اس مقام کے واسطے زمہنا

موزوں ہے۔ کمرے ایک رُخ ۲۲ فٹ لمبا، نہایت شاندار لنگر خانہ ۲۸، ۲۸ ستونوں کی تین قطاروں پر قائم ہے۔ یہ ستون خالص ہندی وضع کے ہیں۔ صرف ہستون پر شاخدار پھن یا کھڑکی لکھنے کی بجائے جو مند و عمارات میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے اسی وضع کے پتے تراش دیئے ہیں اور شمال کی جانب دروازے کا کمانچہ ہے جس کے ستون اور طرز تعمیر خالص ہندی ہیں۔

مگر منڈو کے محلات غالباً اس کی مسجدوں سے بھی بڑھکر قابل دید ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جہاز محل ہے جو دو تالابوں کے وسط میں ہونے کے باعث اس نام سے موسوم ہوا اور واقع میں جہاز کی طرح قریب قریب وسط آب میں قائم ہے۔ یہ بڑی وسیع عمارت ہے جس کا مشرقی رُخ ۲۶ فٹ کے قریب لمبا اور ۱۸ فٹ بلند ہے۔ اس کے پنج میں محراب دار دروازہ جس کے بالائی رُخ سنگ مرمر لگایا ہے اب تک خاصی طرح سلامت ہے۔ اس کے اوپر صراحیاں دے کے چھجا اور پھر ایک صراحی دار مجعدہ نکالا ہے جس کی صورت ایک مستطیل بارہ درمی کی سی ہے۔ نیچے کی منزل میں ہر رُخ پر پانچ پانچ کمانیں ہیں اور ان کے اوپر بہت چوڑا چھجا تھوڑا ہے۔ سامنے کے رُخ کے دونوں سروں پر قبہ دار کمانچے بنے ہوئے ہیں ایک طرف پہلو کی شکستہ عمارات کا جانی سلسلہ اور مقابل کھیت

سہ مولف نے اسے دہرہ سالہ لکھ دیا ہے جو اس قریب صریحاً غلط ہے۔ مترجم



دوسرے مکانات اور چھت پر جانے کا زینہ ہے۔ مغرب کی جانب سے جدھر یہ تالاب پر چھایا ہوا ہے، دیکھئے تو مجموعی طور پر یہ ایک حیرت انگیز عمارت ہے۔ وسعت اور خوشنما نقشے کے اعتبار سے یہ اپنے زمانہ کی سب سے بہتر عمارتوں میں سے ہے اور ہر چند وہ نفاست اس میں نہیں جو بعد میں مغلوں نے دکھائی تاہم ایک جنگ جو مملکت کے آزاد پٹھان بادشاہ کے شایان شان محل ضرور ہے۔ عمارت کا صدر حصہ ایک لداؤ کا ایوان ہے جس کا عرض کوئی ۲۴ فٹ، طول اس سے دگنا، اور بلند سی ۲۴ فٹ ہے اس کے عقب میں دونوں طرف جو پستے بنائے ہیں وہ اتنے چوڑے ہیں کہ چوکنے لداؤ کے لئے کافی تھے۔ ایوان کے اگلے سرے پر نہ منزل مکان ہیں جن میں سب سے اوپر کی منزل پر بھگتے درجے یا جھروکے آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد لداؤ کے والائوں کا ایک طویل سلسلہ پانی کے بیج میں بنا ہوا ہے جو ظاہر محل کے رنے بنے۔ حصے تھے محل کے دوسرے حصوں کی طرح یہ بھی بلند اور اتنے چوڑے آثار کے ہیں کہ ہندوستان کی عمارتوں میں کم دیکھنے میں آتے ہیں لہذا ان کے دیکھنے سے ویسا ہی اثر یا رب بھی پڑتا ہے۔

وادے زبہ کی آگے بڑھی ہوئی چٹان کے کنارے پر ایک اور محل باز بہادر سے منسوب ہے جو نسبتہ ہلکی اور زیادہ صاف ستھری عمارت ہے۔ غالباً اسے ناصر الدین خلجی نے ۱۳۵۷ء میں بنایا تھا مگر یہ شمالی محل سے بھی زیادہ شکستہ حالت میں ہے اور محض کے بعض حصوں یا والائوں کی گدیوں کے سوا، اور قریب قریب ساری عمارت منہدم ہو چکی ہے۔ اس کے اوپر کی طرف پہاڑی پر روت مٹی کی چھتری سے جواب تک خاصی طرح سلامت رہی ہے، جامع مسجد کے شمال میں ہندو محل واقع ہے جو اپنے چوڑے آثار کے باعث دوسری عمارتوں کی نسبت کچھ بہتر حالت میں محفوظ رہا۔ اس خوشنما عمارت کی رشتہ دار اسلامی دیواریں، آگے نکلے ہوئے جھروکے اور اندر دلی ہوسی کھڑکیاں اس کا استحکام ظاہر کرتی ہیں۔ اندر کا بڑا ایوان ۱۶ × ۸ فٹ لمبا، ۲۴ فٹ چوڑا اور ۳۸ فٹ اونچا ہے۔ اس کی چھت کمانوں پر قائم کی ہے اور پورا ایوان نہایت

مالیشان بنا ہوا ہے۔ اس کے شمال جانب نیچے گوہم اور اوپر زنان خانہ تھا۔ میڑ میں تھوڑی دور پہٹ کر زیر زمین حوض اور ان کے کناروں پر تہ خانے بنے ہیں کہ گرمیوں میں اس چمپا باؤلی کے زمین دوز مکانات میں دوپہر گزاری جائے۔ ان سے وہاں تمام اور خوش مذاقی ثابت ہوتی ہے جو پانچو برس پہلے مسلمان اپنے محلات میں ایسے لازم آسائش بہم پہنچانے میں صرف کرتے تھے کہ ہندو لا محمل کے شمال میں نہار جھروک محمل بھی اسی چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ اس کے باہر دلاور خاں غوری کی مسجد ہے جو سنگلہ میں پرانے طے سے تعمیر ہوئی اور منڈ دکی سب سے قدیم مسجد ہے مگر اس کی سادہ ساخت بھی پٹھانوں کے طرز تعمیر کی خصوصیات دکھائی ہے کہ جہاز محمل کے جنوب میں ایک سہ منزلہ عمارت طوبی محل کہلاتی ہے جس میں بلند عربی محرابوں کی قطاروں پر چوٹے چوٹے آثار کی ملاوٹ دیکھ مالائی نہیں اور نیچے چوڑی چوڑی پتھر کی اولیتان بنی ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے تالاب اور کھنڈروں کے سلسلے سے عجیب اور قابل دید منظر پیدا ہو گیا ہے کہ پوری سطح مرتفع پر عمارات و مقابر کے آثار شکستہ پھیلے ہوئے اور یہ اتنی انواع و اقسام کی ہیں کہ اعلاطہ تحریر میں لانا دشوار ہے۔ ایک وسیع اور ویران جنگل کے سناٹے میں انھیں سب سے آگے تھلک دیکھ کر مسلمانوں کے چند روزہ بادشاہی خاندانوں کی شان و شوکت کا وہ سماں آنکھوں میں بھر جاتا ہے کہ ہندوستان بھر میں کسی دوسرے مقام پر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اور اگر احتیاط سے ان کی تصویریں لی جائیں تو یہی آثار قدیمہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ان کے بانی صنعت تعمیر کے اصلی اصول سے حیرت انگیز واقفیت رکھتے تھے کہ یہاں اور علیٰ ہذا دوسرے مقامات میں فن عمارت پر بڑا اثر مصالحے

لے۔ اصل معنی طویلہ تھا محمل بعد میں ہتھانی باشندوں نے انھیں یہاں کی عمارت عجیب معلوم ہوئی، اضافہ کروایا۔ اس پرے مضمون کے لئے مولوی غلام زیدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ کی محققانہ کتاب ”ہندو“ مطالعہ کے قابل ہے کہ مبرم۔

کا پڑا ہے جو قریب میں مل سکتا تھا۔ جامع مسجد کے پائے دیکھ کر ہی سنگ مرخ (بھجھر) پتھر کی افراط کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے تین سو سے زیادہ پائے اس پتھر کی ایک ایک ڈال کے بنے ہوئے ہیں۔ پھر دیواروں اور پائوں میں سنگ تراشی کے واسطے سفید اور رنگین دونوں قسم کے سنگ مرمر سے کام لیا گیا ہے۔

منڈوئی عمارات میں ایسی (ہندو) باشندوں کے عمودی طریقوں کی آمیزش کے بغیر خالص قوسی طرز دیکھنے میں آتا ہے اور گو اسی زمانے کی جو نیوری اور بھرائی عمارتوں میں ہم اسلامی طریق تعمیر میں ہندی طریقوں کا روز افزوں اثر معائنہ کرتے ہیں لیکن منڈو میں ایسی ہندی اشکال و اوضاع سے قطعی احتراز کیا گیا ہے اور مہار برابر اسی نیکی محراب کے طرز پر قائم رہے ہیں، اگرچہ بعد میں مکمل بنائوں کی محرابوں میں جو بیچ و خم نکالے گئے، ان کی بظاہر منڈو میں کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

لے ملاحظہ ہوں: "مہتری اوت منڈو" (طبع ثانی ۱۹۵۷ء) دو منڈو منڈو (کیمپین میس بنڈو) رسالہ ایشیاک سوسائٹی، ۱۹۵۷ء۔ نیز بات منڈو: "آرکیولوجیکل سروے اینڈ رپورٹ" باب منڈو، ۱۹۲۳ء۔ وغیرہ۔

# باب ہفتم

## بنگالہ

بنگالے کی محبتیں مسجد قدم رسول، گور۔ مساجد سونا۔  
ادیتہ واک لکھی، مالدار۔ مینار۔ بڑے دروازے ڈ

## پالے تخت گور

یہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا کہ مالوے کے معمار دار السلطنت دہلی کے مقوس طرز کے اس قدر گرویدہ کیوں رہے حالانکہ ان کے جو پوری اور احمد آبادی بھائی عمودی طرز کے شہید ہو گئے تھے اور جہاں کہیں موقع ملتا اسی سے کام لیتے تھے۔ دھار کی مسجد بنانے والوں کے سامنے بھی ہندی وضع اختیار کر نیچے وہی اسباب ترغیب موجود تھے اور ہندو اور ہینی مندروں کا بقنا مصالحہ کہیں انہوں نے استعمال کیا، اس سے بھی زیادہ دل سخت تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہندی طرز مستعار لیتے ہیں نہ اس کی نقل کرتے ہیں بلکہ اسی نیکی محراب کی وضع پر جمے ہوئے ہیں جو غیر ملکوں میں اسلامی طرز کی خصوصیت ہے لیکن اہل مالوہ کی طرح بنگالے والوں نے عمودی طرز بھی نہیں اختیار کیا تو اس کی وجہ سمجھنے میں کچھ دشواری نہیں۔ اس ملک میں پھر قریب قریب عفا ہے اور ستون یا کھمبے بنانے کی اور کوئی مناسب شے بھی میسر نہیں آتی۔ لہذا اینٹ کے سوا اور کوئی مصالحہ

نہیں ملا تو انہوں نے خواہی منخواہی ہر جگہ اور ہر عمارت میں جسے پائے دار بنانا تھا، محرابوں سے کام لیا۔ مگر یہ بنگالی طرز جو ہندوستان خاص میں خالص اینٹ کا واحد نمونہ ہے، ایک ایسی مقامی خصوصیت رکھتا ہے جو نہایت عجیب و غریب ہے اگرچہ مصالحوں کی نوعیت کی بناء پر اس میں فن کی بعض وہ اعلیٰ صفات نہیں سمجھیں جو بہتر و کلاں تر مصالحوں کی عمارتوں کی خصوصیت ہیں۔ بنگالی محراب کی وضع کو ترقی دینے کے علاوہ بنگالی مہاروں نے چھت کی ایک نئی وضع بھی ایجاد کی جس کا زمانہ حال تک اسلامی اور ہندو عمارات پر بہت کچھ اثر پڑا۔ اس کتاب کے گزشتہ حصے میں ہم اتور کی چھتری کا ذکر کر چکے ہیں۔ اسی اصول پر بنگالیوں نے بانس کی لچک سے فائدہ اٹھایا اور اپنے مکانات میں عام طور پر کروڑی شکل کی چھتیں بنانے لگے جو ان کی نظر کو اتنی مائوس ہوئیں کہ وہ انہیں خوبصورت سمجھتے ہیں۔ بانس ادھس کی ایسی چھت بنائیں تو در واقع میں خوشنما بھی ہوتی ہے لیکن اینٹ یا پتھر کی عمارت کے معاملے میں اسے حسن و ذوق کا نمونہ کہنے میں کلام ہے۔ اگرچہ تعمیر میں رسمیات کو استقدر دخل ہے اور خوبصورتی اس درجہ ذہنی تلازم پر مبنی ہے کہ ایسے معاملہ میں پر دسی انخاص مشکل سے حکم ہو سکتے ہیں۔ بہر حال اتنی بات ضرور ہے کہ یہ کروڑی وضع بنگالے میں ترقی کر کے مستقل لطاز عمارت بن گئی تو سترھویں صدی میں اس کا اثر دہلی، اور اٹھارویں صدی میں لاہور تک پہنچا اور اندازاً ۱۸۵۷ء سے آگے تک جس قدر عمارتیں بنیں، ان سب میں کم و بیش یہ اثر پایا جاتا ہے کہ

عمارت میں رسمیات اور معیار حسن میں عادت کو جس قدر دخل ہے، اس کی یہ بھی ایک عجیب مثال ہے کہ گواہل فرنگ کو یہ وضع ہمیشہ بدنامعلوم ہوتی رہی مگر اہل ہند میں، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اسے زمانہ حاضرہ کی نہایت مطلوب و نفیس نئی وضع سمجھا جاتا ہے۔

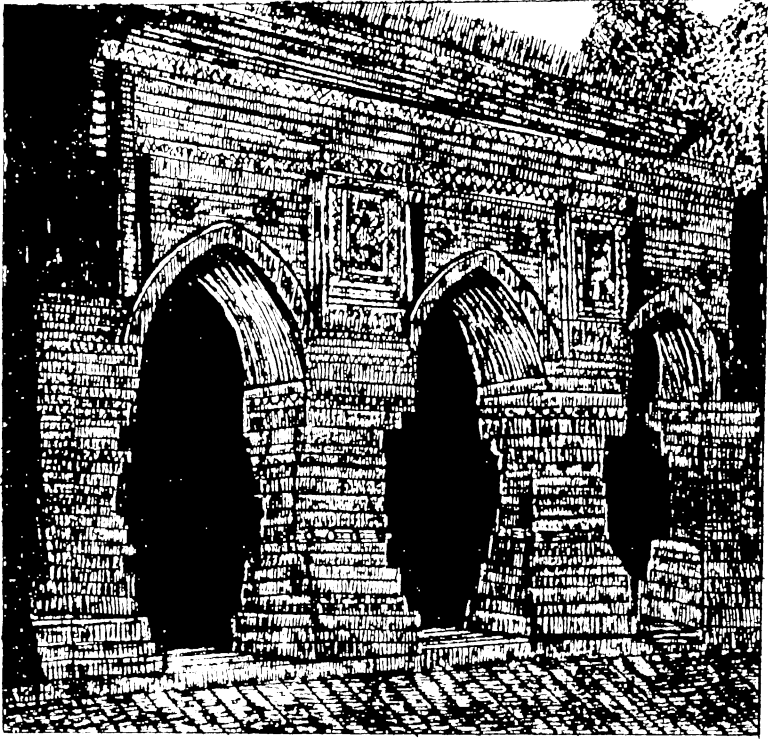
۱۸۵۷ء رومی اور اطالی سار بھی درپوں پر اسی قسم کے کروڑی ساٹان بناتے ہیں اور گوڑا یہ وضع بجا خود قابل نفرت ہو لیکن غلامی ہونے کی وجہ سے ہم سبھی انہیں استعمال اور پسند کرتے ہیں۔

گمران مقامی اور مختص اوضاع سے قطع نظر، بنگالے کے اسلامی پائنت  
گور کی عمارات اپنی وسعت اور انواع و اقسام کی صناعمی کی بنا پر التفات خاص  
کی مستحق ہیں۔ مسلمانوں میں قطب الدین ایک نے دہلی فتح کی اور اسی سال  
محمد بن تغلق نے گنگا کے کنارے کنارے بنگالے تک سارا علاقہ فتح کر لیا۔ ہندیا  
کی تاریخ کے ساتھ ہی اس نے ۱۲۹۱ء میں لکھنؤ کی یا گور میں دہلی بنگالہ بن کر  
حکومت شروع کی اور سلطان آباد نے بھی اس عہدے پر اس کی توثیق  
کر دی۔ اس کے بعد کے دہلی قریب قریب خود مختاری کے ساتھ حکومت کرتے  
رہے اور ۱۳۰۱ء میں سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا ناصر الدین بوزاں دہلی والی  
مقرر ہوا، تو یہ عہدہ اس کے خاندان میں موروثی ہو گیا۔ ۱۳۲۳ء میں ناصر الدین  
مبارک نے سریشی کی اور دہلی بنگالہ قادیان کو ہلاک کر دیا اور مشرقی اور  
مغربی بنگالے میں الگ الگ حکومتیں ہوتی رہیں آخر ۱۳۲۵ء میں مغربی بنگالے  
کے حاکم نور محمد الدین الیاس نے تلوار کے گھاٹ اتارا اور مشرقی بنگالے کے  
والی اغیاث الدین غازی شاہ کو شکست دی۔ اس طرح وہ ایک نئے (پوریا)  
خاندان شاہی کا بانی ہوا جو تقریباً ڈیڑھ صدی یعنی ۱۳۲۵ء تک فرمانروائی  
کرتا رہا اور ان کی بادشاہی جیشوں نے اور پھر ۱۳۹۳ء میں علاء الدین حسین شاہ  
نے چھین لی۔ مگر اس بادشاہ کے بیٹے محمود کے زمانے میں جہاں کے افغان  
حاکم خیر خاں (سوری) نے ۱۳۵۲ء میں بنگالے پر حملہ کیا اور گور کو بالکل تاراج  
کر ڈالا جس کے بعد سکیم وسیع و وسیع شہر ویران ہونے لگا اور اس کی  
عمارتیں کس مہر سی میں رہ گئیں۔ آدو شاہ خلف سلیمان کے زمانے میں یہ ساری  
ریاست افسر کی وسیع سلطنت میں ضم ہو گئی (۱۳۵۶ء)  
بنگالے کے ان حاکموں نے کوئی ایسا کارناما نہیں کیا کہ ہندوستان  
کی عام تاریخ میں ان کو متاز جگہ حاصل ہوتی لیکن وہ ہندوستان کے ایک  
زرخیز ترین ملک کے مالک تھے اور اپنی دولت کثیر پائے تخت کی تعمیر میں  
دارائش میں صرف کرتے تھے یہ عمارتیں اگر ذوق کے اعتبار سے ہمیشہ بہت  
اعلیٰ نہ ہوتی تھیں تو بھی آرائش و نعل میں یقیناً دیکھنے کے قابل ہونگی لیکن بنگالے کی

آب و ہوا آثار قدیمہ کی خاص طور پر دشمن ہے۔ انجیر یا گور کی قسم کا کوئی درخت مکان کی کسی دراڑ میں ایک بار بھی جگہ پا جاتا ہے تو پھر اس عمارت کی خیر نہیں رہتی۔ یہ نہ بھی ہو تو بھی روئیدگی کی وہ کثرت ہے کہ عمارت کو ڈھونڈنا، اور کم سے کم ان کی اصلی حالت کا پتہ چلانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس سبب طرہ یہ کہ گور ایسی جگہ واقع ہے جہاں سے براہ دریا بلنبہ مصالحہ لے جانا خاص طور سے آسان ہے۔ گرمی کے سیلاب کے وقت کشتیاں اس کے کھنڈرات میں ہر جگہ پہنچ سکتی اور اینٹ پتھر وغیرہ بھر کر بہاؤ کے رخ جہاں کہیں نیا شہر بنتا ہو، وہاں بلاؤقت پہنچا سکتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ قریب آباد، تالدا، رنگت پور، اور رانج محل سب کے سب قریب قریب اسی گور کے بلنبہ سے تعمیر ہوئے، اور خود ہنگلی بلنبہ کلکتہ بھی ہنگالے کے اسی قدیم پائے تخت کی غنیمت سے سجونی بہرہ مند ہوا۔ سچا لیکہ خود گور ایک قابل دید ڈھیر رہ گیا جس کے کھنڈروں میں اصلی صورت کا پتہ چلانا تقریباً محال ہے۔

مسلمانوں کے قبضے میں آنے سے بہت پہلے گور ہندوؤں کا مشہور صد مقام تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سین اور پال خاندان کے راجہ یہاں سکونت رکھتے تھے اور انہوں نے ضرور اسے عمارات اور مندروں سے جو ان کی دولت اور شہرت کے شایان شان ہوں، اسے آراستہ کیا ہو گا۔ مگر یہ عمارتیں غالباً بیشتر اینٹ کی چٹائی کی تھیں گوان میں ستون اور ایک قسم کے سنگ موسیٰ کی، جو حقیقت نہایت باہیک سنگمریزے سے مرکب ہوتا ہے، طاعی کے کام ہونگے کیونکہ اس پتھر پر نہایت عمدہ چلا ہو جاتی ہے۔ اس ہندو صنعت کے بہت سے ٹکڑے کھنڈروں میں دستیاب ہوتے ہیں اور اگر احتیاط سے ان کا امتحان کیا جائے تو ممکن ہے کہ قدیم طرز کا ٹھیک ٹھیک پتہ مل سکے۔ مگر اس میں خاص طور پر دیکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ اس نے بعد کے اسلامی طرز پر کس قدر اثر ڈالا۔ یہ بعد کا اسلامی طرز دہلی، جو پور اور یا کہیں کے طرز کے مطابق نہیں ہے بلکہ خالص مقامی اور بذات خود کافی خوبی و خوشنمائی رکھتا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت بھاری بھاری اور چھوٹے پتھر کے ستون ہیں جن پر محرابیں یا لداؤ اینٹ سے تیار کئے جاتے تھے

حالانکہ دوسری جگہ مثلاً جوہپور میں، ہلکے ہلکے ستونوں پر سیدھے گردنے اور چٹھی چھتیں ڈال دی ہیں۔  
 بنگالے کی طرز کی عام کیفیت قدم رسول مسجد کے نمونے سے ظاہر ہوگی۔  
 جو گورکھ کے قلعے کے جنوب مشرقی دروازے پر اپنی ہوئی ہے اور حسن تعمیر سے  
 عاری نہیں ہے۔ بخشی عمارت



تصویر نمبر ۴۰۵

میں جو قدرتی کمزوری ہوتی ہے اس کی بہت کچھ تلافی مضبوط سہاروں سے

۱۔ یہ مسجد حضرت شاہ نے ۱۲۵۱ھ میں تعمیر کی تھی کہ اس کا بابا حسن شاہ (۱۲۹۲ تا ۱۳۱۹ھ) جو پتھر  
 مکہ منظر سے لایا تھا اور اس پر پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نقش پائے، وہ اس مسجد میں  
 رکھا جائے گا۔



ہو گئی ہے اور دوسرے اجزاء کے چھوٹے ہونے سے جو بدنہائی پیدا ہوتی اُسے شروع ہی سے ستونوں کے چوڑے چوڑے پائے بنا کے جن پر محرابیں قائم ہیں، دو کر دیا ہے۔ رُوکار میں تنوع پیدا کرنے کی غرض سے یہ بھی سیدھی چوڑی تختیاں اور ٹوٹھلی ہوئی اینٹ کی پتیاں ڈالی ہیں اور انہی کا سلسلہ بدل دے کے پورے گردنے سے ملا دیا ہے اس عمارت میں چھتیں بھی کروسی وضع کی بنائی ہیں جو اس طرز تعمیر کی خاص خصوصیت ہے اگرچہ یہاں کمریت بہت خفیف ہے جو خاص گوتہ کے اندر سونا مسجد جو بارہ دروازہ مسجد بھی کہلاتی ہے، نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ اس کا رُوکار پتھر کا ہے جس میں ذرا ذرا اُبھرے ہوئے کھل بوٹے تراشے ہیں یہ گویا چوبی کام کی نقل ہے جو عام طور پر سٹیل تھا اور کائنات نگر مندر بننے کے زمانہ تک جس کا کتاب کے پہلے حصے میں ذکر آچکا ہے (رُوکار میں انہی مقبول طریق سے قرین کی جاتی تھیں۔ اس مسجد کے اندر کے اکثر ستون ہٹا دیئے گئے جس سے لداؤ کی چھتیں گر پڑیں اور اب اگر خود درخت پوری عمارت دیکھنے کا موقع بھی دیں تو بھی اس کی تعمیر کی خوبی کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ مگر آئندہ صفحے پر ہم نے پنڈوا کی مسجد آدینہ کا جو نقشہ دیا ہے اسی سے اس مسجد کی ترتیب بھی کسی حد تک سمجھ میں آ سکتی ہے۔ پنڈوا مسجد مذکور کی تعمیر کے وقت پائے تخت کا شمالی ناچیمہ تھا اور

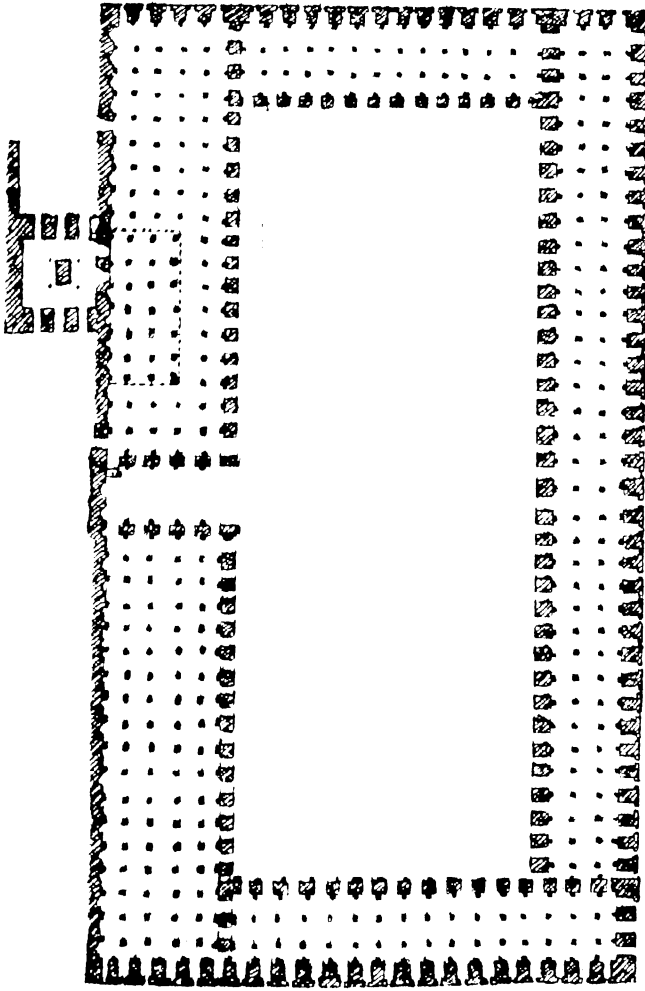
قلعے کے باہر شمال مشرق میں ایک اور مسجد بارہ سونا مسجد کہلاتی ہے اور غالباً گوتہ کے آثار قدیمہ میں اس سے زیادہ خوشنما کوئی عمارت محفوظ نہیں ہے۔ اسے ۱۵۲۶ء میں نصرت شاہ نے بنایا تھا۔ باہر سے اس کا طول ۱۶۸ اور عرض ۶۷ فٹ ہے۔ ۸۰ فٹ چوڑے آثار کی دیواریں ہیں جن کے اندر باہر نگین سنگ رخام کا حاشیہ ہے۔ سامنے گیارہ محراب دار دروازے، ۵ فٹ ۱۱، ۱۱ فٹ ۱۱ اور ۱۴ فٹ بلند بنائے ہیں۔ ان سے پیش دالان میں داخل ہوتے ہیں جس کی چھت گیارہ گنبدوں کی اور ان کے نیچے بھی گمناں بنائی ہیں۔ اس کے آگے مسجد کی صدر عمارت ہے جس کی چھت شتر پڑی مگر اس میں طوالتین دالان میں ستونوں پر قائم تھے اور دیواریں بھی گیارہ بند محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ دالان کے

سرے کے دروازوں کی دونوں جانب اور عقبی گوشوں میں بادامی سنگ اسود کے پہلو دار مینار (کل ۶) بنائے تھے جن کی برجیاں اب شہتہ ہو گئی ہیں۔ غرض و طول اور زبردست آثار دیکھ کر ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسی پُر شکوہ عمارت ہو گی۔ حقیقت میں اسلامی طرز کی اکثر ملکی محرابوں کے مقابلے میں گور کی تعمیر کی خصوصیت یہاں بہت ممتاز دہنایاں ہو گئی ہے۔

کتبتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد آدینہ کو اسن شاہی نسل کے ایک مشہور ترین فرزند واسکنہ رشاد (۳۵۸ھ تا ۳۸۹ھ) نے اس غرض سے بنوایا تھا کہ اس کے احاطے میں یا باہر قریب ہی اپنی قبضوائے مسجد کی چار دیواری نہایت وسیع ہے یعنی شمالاً جنوباً ۵۰ اور شرقاً غرباً ۲۸۵ فٹ چوڑی ہے۔ وسط میں ۴۰ x ۵۴ فٹ کا صحن اور ہر طرف اینٹ کی بہت چوڑی دیوار ہے جس میں برابر کی ۸۶ کمائیں بنائی ہیں اور صرف محراب قبلہ زیادہ چوڑی اور شاندار ہے۔ مسجد کی چھت بھی ۱۰ فٹ اونچ اور نیچے سے دو دو فٹ کے چوکور ستونوں پر جن کی کل تعداد ۲۶۰ ہے تیار کی ہے بعض ستون سیاہ پتھر (رخام) کی ایک ڈال کے ورنہ باقی سب اسی طرز کے ہیں جیسے مسجد قدم بول کی تصویر میں دکھائے جا چکے ہیں۔ ان کے عرشنا اور شاندار ہونے میں شک نہیں لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ تنوع سے عاری ہیں ان ستونوں اور عقبی دیواروں پر ایک ہی وضع اور ساخت کی ۸۶ گمہ یاں بنائی ہیں اور یکسانیت میں ف ایک چوڑے نے فرق پیدا کیا ہے جو ”بادشاہ کا تخت“ کہلاتا ہے اور ایک حصہ عمارت کو دو مندرلوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس کی چھت ۲۱ چھوٹے اور بھاری اور بعض پتھر کی ایک ڈال کے سبک اور نیس ترستونوں پر قائم تھی مگر چھت گر گئی اور دوسرے سہارے کے بہت کم ستون اب سلامت رہ گئے ہیں۔

تصویر چھوڑ دی

۱۔ اس کا شہتہ مقبرہ مغربی دیوار کے شمال سرے کے متصل ہے۔



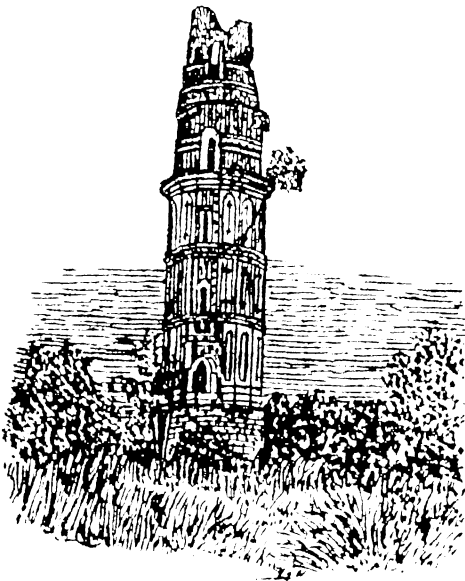
تصویر نمبر ۲۰۶

مسجد آدینہ کی ساخت کسی کارواں سرائے کے لئے زیادہ سوزوں ہوتی۔  
 کیونکہ اگر عمارت میں محض خوشنمائی پیدا کرنی مقصود تھی، تو اس کے لئے اتنی  
 یکسانیت کچھ پسندیدہ نہیں نظر آتی۔ پورے مجموعے میں یہ نقص پایا جاتا ہے اور اگرچہ  
 ان کی عظمت و وسعت اور نقش و نگار کی نقاست نیز وہ عجیب اور گھنا جھنگل جس کے  
 اندر یہ کھنڈر ڈکے پڑے تھے، مجموعی طور پر ان عمارت کو تصویر بنانے والے کے لئے

نہایت دلکش چیز بنا دیتے ہیں مگر جنوبی ہند کے ہزار ہزار ستون کے ایوانوں کے متعلق جو اس مقام تک اس کتاب کے پہلے حصے میں بیان کر آئے ہیں وہ سب یہاں بھی موجود ہیں واقع میں بعض دفعہ تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پھر کسی تامل سنسکرت کے علاقے میں آگئے جن کی خصوصیات سطح کے باہر اُبھری آتی ہیں اگرچہ ان پر ایک غیر قوم کی پوش پڑی ہوئی ہے تو

مسجدِ آدینہ سے دو میل جنوب مغرب میں اک لاکھی مسجد یا مقبرہ واقع ہے۔ مقبرہ کہلانے کا سبب یہ کہ یہاں غیاث الدین اعظم شاہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی قبر بتائی جاتی ہے لیکن کوئی کتبہ موجود نہیں اور ممکن ہے کہ یہ عمارت جلال الدین محمد شاہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی بنوائی ہو جو بڑا عمارت گر گزرا ہے۔ یہ گنبد کے نیچے اسی فیٹ مرتع عمارت ہے جس میں بہت سا مصالحہ مندی مندی کے لیے سے لیا گیا ہے اور اینٹ اور سنگ رخام سے چٹائی کی ہے۔ تزئین کی

غرض سے جا بہ جا منقش اینٹیں لگائی ہیں۔ کونے کے پشتوں پر بڑے تکلف کے پیل بوئے بنے ہوئے ہیں جن سے میناروں کے نقش و نگار یاد آتے ہیں گران شیوں کو صرف چھت کی سطح سے کچھ اوپر منڈیر یا ٹولی بنا کے دونوں طرف سے نیچے کے رُخ موڑ دیا ہے۔ اگرچہ یہ عمارت بہت چھوٹی ہے مگر فن کے اعتبار سے مسجدِ آدینہ سے زیادہ خوبصورت اور اعلیٰ کمال کا نمونہ ہے اور اس مقام کے سب سے دلچسپ آثار میں ایک مینار ہے جو قلعے سے بڑھتے ہی جانب مشرق استادہ ہے



تصویر مشرق

اس کی دو تہائی بلندی دوازہ پہلو ہے اور اس کے بعد وہ ۴۴ فیٹ کی بلندی تک گول چلا یا گیا ہے۔ اس کا دروازہ زمین سے خاصا اونچا رکھا ہے اور مجموعی طور پر یہ آرک لینڈ کے گول برجوں سے بہت مشابہ ہے اور ان کے سوا اور کوئی عمارت اس نمونے کی ہمارے علم میں نہیں ہے، اگرچہ اس بات کا مطلق قرینہ نہیں کہ آرک لینڈ اور یہاں کی عمارت میں کوئی تعلیق ہو گا مگر غالباً اس مینار کے گرد پہلے ایک ۵۵ فیٹ اونچا چوڑا بنا ہوا تھا لیکن ایسا ہو بھی تو بھی اب وہ بالکل غائب ہو گیا ہے۔ مینار کے اندر چکر کھاتا ہوا زینہ چوٹی کے کمرے تک چلا جاتا ہے جس کے اوپر گنبد بنا ہوا تھا عجب نہیں کہ یہی قطب مینار اور گول اور دولت آباد وغیرہ مقامات کی میناروں کی طرح سطح کی یاد گار میں تعمیر کیا گیا ہو۔ بیان کرتے ہیں کہ اس پر ایک کتبہ کندہ تھا جس میں اس کی تعمیر سیف الدین فیروز سے منسوب تھی جو ۱۲۸۷ء سے ۱۲۹۰ء تک گور کا حکمراں رہا۔ طرز عمارت سے بھی اس کی پوری طرح تصدیق ہوتی ہے مگر مقامی روایت یہ ہے کہ اس کی چوٹی پر ایک درویش پیر آٹا نامی رہا کرتے تھے جن کے ان عمارتوں کے علاوہ گور میں کئی بڑے دروازے خاصے شاندار بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اچھا قلعے کا شمالی دروازہ ہے جسے داخل یا اسلامی دروازہ کہتے اور رکن الدین باریک شاہ (۱۲۸۷ء تا ۱۲۹۰ء) کی تعمیر بتاتے ہیں۔ اگرچہ یہ اینٹ کی عمارت ہے اور صرف کچی مٹی سے اس پر پیل بولے بنائے ہیں لیکن اس قسم کی عمارتوں میں جہاں کہیں بھی ہوں، یہ پرنی شان کی چیز ہے، شہر کا جنوبی اور اسی طرح بالاحصار کا دروازہ اس بات کی بہترین مثال ہیں کہ اینٹ اور صرف اینٹ سے کیسی عالیشان عمارت بن سکتی ہے۔ شہر کے اس دروازے کو کو توالی دروازہ کہتے ہیں۔ یہ پرانی بستی کے جنوبی رخ سے باہر جانے کا راستہ ہے اور نہایت خوبصورت و پر شکوہ ہے۔ بالائی حصے کے سوا یہ خاصی درست حالت میں سلامت ہے۔ محراب کی کیلی تک بلندی ۳۱ فیٹ اور نیچے پوری

۱۷۰ فٹ غالباً یہ فیروز شاہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے ۶

ڈیوڑھی کا عرض ۱۵ فٹ ہے۔ جنوبی رخ دونوں پہلوؤں پر نیم دائرے کی شکل میں فوجی پیرے کے لئے دمے بنے ہوئے تھے۔ لیکن صرف عمارات کی دست یا کاریگری کے کمالات ہی گور کی عظمت کا سبب نہیں ہیں بلکہ اس کی اصلی عظمت و شان و عجیب و غریب کھنڈر ہیں جن کا سلسلہ جنوب میں پٹوا سے لے کے قریب قریب میں میل تک، جو کبھی گنگا کا کنارہ تھا چلا گیا ہے اور ان میں صد ہا مقابر و مساجد (بعض اب تک آباد اور بعض بالکل مٹی کا ڈھیر) مندر، حوض اور برج دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں جن میں نہ اب کوئی ترتیب ہے نہ بھیساک راستہ اور جن کو خود رو درختوں کی کثرت نے جو ہندوستان کے صرف اسی علاقے میں ہوتی ہے، آدمی سے زیادہ مستور و محبوب کر لیا ہے جو چنیر کا غنڈ پر نقشے میں بظاہر ادنیٰ اور معمولی ذوق کا نمونہ معلوم ہوتی ہے، مگر بے کہ وہی برائے عین گذشتہ شان و شوکت کا مرقع نظر آئے اور اس کا خاسہ ہندوستان کا کوئی قدم پائے تحت ایسا عجیب و غریب اور اسی کے ساتھ بنائیت مال اگینر نقش دل پر نہیں چھوڑتا جس قدر کہ بنگانے کے اس پرانے افغانی پائے تحت کے معائنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۷ جے ایچ، ایون شا کی کتاب "گور، اس رومن اینڈ اس کرپشنز" (۱۹۰۷ء ایم، مارٹن پبلیشرز انڈیا) "ریپورٹس" وغیرہ وغیرہ۔  
 ۱۸ ۱۹۰۷ء میں جب سے یہاں کاشت شروع ہوئی اور جھل کا ٹاکیا نیز حکومت بنگالہ نے ان کھنڈروں کی طرف توجہ کی اس وقت سے ان آثار قدیمہ تک آسانی سے رسائی ہونے لگی ہے۔

# باب ہشتم

## گلبرگہ

مسجد گلبرگہ - مدرسہ بیدار - مقابر۔

## نشین

- علاء الدین حسن گنگو بہمنی، دربار تعلق کا سردار ..... ۱۳۲۷ھ  
 محمد شاہ غازی (اول) ..... ۱۳۵۰ھ  
 مجاہد شاہ ..... ۱۳۷۵ھ  
 محمد شاہ (ثانی) ..... ۱۳۷۵ھ  
 تاج الدین فیروز شاہ (جس کی راک و جیانگر کی بیٹی سے شادی ہوئی) ..... ۱۳۹۷ھ  
 احمد شاہ (اول) (پائے تخت بیدار) ..... ۱۴۲۲ھ  
 علاء الدین احمد شاہ ثانی ..... ۱۴۳۵ھ  
 کلیم اللہ (آخری تاجدار خاندان بہمنی) ..... ۱۵۲۵ھ

- قاسم برید بانی برید شاہی ..... ۱۴۹۲ھ  
 علی برید (طلانیہ بادشاہی اختیار کرتا ہے) ..... ۱۵۲۲ھ  
 امیر برید شاہ (خاندان کا آخری بادشاہ) ..... ۱۶۰۹ھ  
 چودھویں صدی عیسوی میں سلطان علاء الدین خلجی اور محمد شاہ تعلق کی

جنگ آریوں نے، راستس کماری اور علیج منار تک تمام خبرہ نمایاں اسلامی سطوت کی دھاک بٹھا دی تھی۔ لیکن یہ قرب و قریب ناممکن تھا کہ اس زمانے کے افغان بادشاہ جو اس قدر کم مہند تھے بلکہ کسی ایسی حکومت کی تنظیم کر سکیں، جو اتنی وسیع اور مختلف الاحوال سلطنت پر ایک مرکزی مقام سے، اور وہ بھی دہلی جیسے دور کے مقام سے، حکمرانی کر سکتی ہو۔ محمد تغلق کو اس دشواری کا احساس تھا اور اس نے دولت آباد کو پائے تخت بنانے کی تجویز سوچی تھی۔ اگر وہ اس تجویز میں پوری طرح کامیاب ہو جاتا تو بہت ممکن تھا کہ پورا جنوبی ہندوستان مستقل طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آجاتا۔ مگر یہ نہ ہوا البتہ بل بڑے بڑے حکمران خاندان بلال کا سلسلہ میں خاتمہ ہو گیا اور ورنگل کا خاندان نیم جان کر دیا گیا اگرچہ کچھ مدت تک بالکل مغلوب نہ ہو سکا اور وجیانگر کی نوخیز قوت حاکم ہو کر جنوبی ریاستوں کو مسلمانوں کی دست درازی سے کئی صدی تک بچاتی رہی۔ خلاصہ یہ کہ اگر دہلی کی مرکزی قوت سے آزاد ہو کر اسلامی سلطنتیں یہاں قائم نہ ہو جاتیں تو کچھ عجب نہ تھا کہ دکن مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جاتا اور ہندو شاہیہ بن دھیا پل کے جنوب میں عرصہ دراز تک اپنی حکومت پر قائم رہتے۔

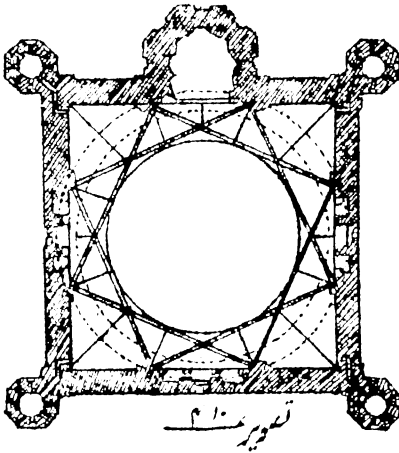
اسلامی بادشاہوں میں سب سے پہلی خود مختار بادشاہی حسن گنگو بہمنی نے قائم کی جو اپنے بانی کے نام پر بہمنی سلطنت گنگوانی حسن، محمد تغلق کے دربار کے ایک برہمن کا ملازم تھا اور اپنے آقا کی وجہ سے ترقی پائی تو شکر گزاری میں اس کا نام اپنے القاب میں داخل کر لیا۔ اس نے ۱۳۴۷ء میں دکن کے ایک قدیم شہر کلبرگ یا کلبرگہ کو مستقر بنایا اور اس کے قریبی اخلاف کے عہد میں یہ سلطنت برابر سے کرشنا اور مشرق میں حدود ریاست ورنگل سے لے کے مغربی ساحل تک پھیل گئی۔ ورنگل و وجیانگر کو ان بادشاہوں نے نہ صرف قابو میں رکھا بلکہ وہاں خراج دینے پر مجبور کیا۔ یہ قریباً ایک صدی کا دور تقریباً ایک صدی تک رہا اور اس کے بعد احمد شاہ اول (۱۳۴۷ء تا ۱۳۶۵ء) نے ۱۳۶۲ء میں انادار سلطنت

”لہ افغان“ سے ترک سلطین دہلی مراد ہیں۔ انھیں مصنف نے ”بیسویں بار برس“ کے نام سے یاد کیا ہے جو اس نے غالباً اس زمانے کے فرنگی بادشاہوں پر قیاس کر لیا ہے جو ترجمہ۔



بیدر میں منتقل کر لیا جس کی وجہ کی کہیں تصریح نہیں ملتی علاء الدین احمد شاہ ثانی کے زمانے میں تازہ فتوحات نے میسور سے گجرات تک تمام مغربی دکن کو شاہان بہمنی کے زیرِ نگیں کر دیا لیکن محمد ثانی کے بعد سے سلطنت کمزور ہو گئی بہمنی سلطانین ایک صدی تک اور سساک سساک کو جیتنے رہے اور آخر میں برہہ شاہی کی صورت اختیار کی۔ مگر اس سے پہلے دکن میں تہنیوں کی جگہ بیجا پور کے عادل شاہی لے چکے تھے جن کی سلطنت سنہ ۱۲۹۱ھ میں قائم ہوئی کہ

دکن کے بائے تخت کی حیثیت سے گلبرگہ کو چند روز جو اولیت حاصل رہی (سنہ ۱۲۹۱ھ تا سنہ ۱۳۲۸ھ) اس دوران میں وہاں کئی اعلیٰ درجے کی عمارتیں بنیں، جن میں ایک مسجد بھی ہے کہ ہندوستان کی سب سے ممتاز مساجد میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ اگرچہ بہت زیادہ نہیں، تاہم کافی وسیع ہے۔ شرقاً غرباً ۲۱۶ اور شمالاً جنوباً ۱۷۰ فٹ، گویا ۲۰، ۳۶ مربع فٹ کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کی بڑی مسجدوں میں یہی مسجد جامع قرطبہ کی طرح پوری کی پوری مصقف ہے، مثلاً اگر اس کا مندر کی مسجد سے مقابلہ کیجئے، جو اور اعتبار سے یکساں ہے، تو بڑا فرق یہی نظر آئے گا کہ مندر کی مسجد کا بڑا حصہ کھلا ہوا صحن ہے جس کے ہر طرف دالان بنے ہوئے ہیں۔ گلبرگہ کی مسجد میں کھلا ہوا صحن مطلق نہیں بلکہ ۱۲۶ x ۱۰۰ فٹ کی پوری مسجد پر ۶ چھوٹے چھوٹے گنبدوں کی چھت پڑی ہوئی ہے اور روشنی منہانے کا انتظام پہلو کی دیواروں میں کمانوں کے ذریعہ کیا ہے جو سوائے مغرب کے جہدہ خاص مسجد اور ۴۵ فٹ پیچھے کو نکلا ہوا محراب و منبر کا مقصورہ ہے نہایت نئی ہوئی ہیں وسطی حصے پر ایک چھوٹا کنڈ بنا کے ۴۰ فٹ قطر کا بڑا گنبد تعمیر کیا ہے اور پہلوؤں میں ۶، ۶ گنبد خور و بنا دیئے ہیں۔ باقی بغلی دالانوں پر ۲۵، ۲۵ فٹ چوڑے گنبد ہیں کہ



اس قسم کی یہ ایک ہی مسجد ہے اس لئے مسجد کی عام طرز سے اس کا موازنہ کرنا دشوار ہے۔ کھلے ہوئے صحن کی مسجد جس کے ہر طرف دالان اور حجرے بنے ہوئے ہوں، ایک خاص قسم کا سکون و اصرام اپنے اندر رکھتی ہے اور یاد الہی کے واسطے نہایت ہی مؤثر مقام ہے لیکن اسی کے ساتھ ہندوستان جیسے گرم ملک میں بعض اوقات شعل آفتاب سے

صحن اس قدر چمکنے اور تپنے لگتے ہیں کہ مسجد میں بیٹھنا تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ اور مستقل طور پر شامیانے یا سامان ڈال کے اس کے تدارک کرنے کی جہاں تک مجھے معلوم ہے کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برخلاف گلبرگے میں ساری مسجد پر چھت ہونے کی وجہ سے تمام نازکی سونچ کی شعاعوں سے محفوظ رہتے ہیں اور چونکہ سب دالان ایک یا دو نول سروں پر سے کھلے ہوئے رکھے ہیں لہذا ناگوار تاریکی ہونے نہیں پاتی اور ہوا بھی ان مسجدوں کی نسبت زیادہ بے روک آتی جاتی ہے جن سے صحن چار دیواری سے گھرے ہوئے ہوں۔ رہی تنہائی اور علیحدگی، تو یہ بات بھی باہر کچھ فاصلے سے احاطے کی دیوار بنادینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ غرض مجموعی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ ان ہر دو طرز میں گلبرگے والی صورت سہولت اور حسن تعمیر و دونوں اعتبار سے بہتر ہے اور وجہ ترجیح اس قدر قوی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا ایک دفعہ آزمائش کے بعد پھر اسی کی تقلید کیوں نہیں کی گئی۔ غالباً اس عدم تقلید کا سبب یہ ہو گا کہ بارش کے زمانہ میں اتنی بڑی چھت کا پانی نہ لٹا دشوار نظر آیا اور پانی کا رکنا یا کہیں درز کا پڑ جانا یقیناً خطرناک ہوتا۔ لیکن گلبرگے کی یہ مسجد تو چار صدی تک قریب قریب باہر

پڑی رہی اور باد و اس تغافل کے اچھی خاصی حالت میں موجود ہے۔ بہر حال وضع کے بارے میں جو رائے بھی قائم کی جائے یہ تو مسلم ہے کہ برائی مسجدوں میں کم سے کم ان میں جو کلیتہً نئے مصالحے سے خالص اسلامی مقبوس طرز پر بنائی گئی ہیں، یہ سب سے اچھی مساجد میں داخل ہے۔ بے شبہ دہلی اور اجمیر کی مسجدوں میں زیادہ دلکشی ہے مگر اس کے اسباب دوسرے ہیں۔ یکا لکھ اسے محض اپنے اصلی نقشے اور ساخت کی بناء پر عظمت و شان حاصل ہوئی ہے لہٰذا جو مسجد کے علاوہ گلبرگے میں ایک بازار لکھ ۵ فیٹ لمبا اور ۶ فیٹ چوڑا ہے جس کو ۶۱، ۶۱ کمانوں کی دونوں طرف قطاریں بنا کے فرین کیا ہے۔ ان کے ستون نیم ہندسی وضع کے ہیں اور دونوں مسردوں پر بڑے تکلف کے مکان بنا دیئے ہیں۔ اس قسم کی ایسی قابل دید عمارت جہاں تک مجھے واقفیت ہے ہندوستان میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ کمانوں کا ایک سلسلہ جو اس بازار سے بہت ملتا جلتا ہے، وجیانگر کے ایک بازار میں بھی تھا جسے جاتریوں کا بازار کہتے تھے اور ممکن ہے کہ اس گلبرگے کے بازار کا ہنر ماں ہو۔

گلبرگے میں اور آثار قدیمہ بھی ہیں جن میں شہر کا ایک بہت بڑا دروازہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ خواجہ بندہ نوازؒ کی درگاہ کے مقابل ۱۶۸۰ء کے قریب تعمیر ہوا تھا۔ شہر کے مشرق میں بعض مالیشان مقبرے ہیں۔ ان میں سات گھنٹی بادشاہوں کے ہیں۔ یہ مربع عمارت پر بہت چوڑے آئینہ کے گنبد ہیں جن کی دیواریں اسلامی دار بنائی ہیں بعض کے بیرونی رخ پر پتھر کے خوشنما نقش درنگار ہیں مگر اس کے علاوہ اور کوئی عمارتی خوبی ان میں نہیں پائی جاتی یہ اندر خوب آراستہ پرستہ ہیں مگر ان میں سرکاری دفاتر اور مکانات بن گئے تھے۔

اس مسجد کا نقشہ میرے دوست مراد نگرہ ڈن نے (جواب لاہور ڈائری) خود بنایا تھا اور کمال غایت سے مجھے مسجد یا مسجد اچھل شکستہ حالت میں ہے۔ ایک زمانہ میں مرث کی جڑ تھی کہ پھس کے کسی باروت خانہ میں آگ لگ گئی اور یہ کام رک رہا۔ لیکن اس کے بعد حال میں دوبارہ شروع کیا گیا ہے۔

اور اب تک (یعنی تحریر کتاب تک) یہی کام لیا جاتا ہے کہ

احمد شاہ اول نے گلبرگ چھوڑ کر، یہاں سے کچھ اوپر ساٹھ میل کے فاصلے پر، بندر کو اپنا پائے تخت بنایا تو نئے دارالحکام کی عمارات عالیشان سے جو شاہان بہمنی کی عظمت کے شایاں تھیں، زیب و زینت بڑھائی۔ مگر یہ اب بہت شکستہ حالت میں ہیں۔ ان میں سب سے پر شکوہ عمارت خواجہ مسعود گاداں کا دروازہ نظر آتی ہے جو محمد ثانی کا بادشاہ گمر بہت وزیر تھا یہ ۲۰۵ × ۸۰ فیٹ کی عمارت تھی جس کے مشرقی رخ، مسروں پر رفیع الشان برن بنے ہوئے تھے۔ ان برجوں کے ساتھ یہ سہ منزلہ مدرسہ جس کی پوزی ر دو کار ورنہ کم سے کم برجوں کی بیرونی سطح پر مینا کاری کی تھی، حقیقت میں ایک عجیب عمارت ہوگی یہ معلوم ہوتا ہے اس کی تکمیل بانی کی وفات سے دو سال قبل مسلمانہ میں ہوئی اور مورخ فرشتہ کے زمانے میں یہ ہندوستان کی جامع ترین اور نہایت بارونق جامعہ میں گنی جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ ۱۷۵۷ء میں مالگیری لشکر نے اس کا محاصرہ کیا تو اس میں ایک باروت کا ذخیرہ جمع کیا گیا جس میں عہدایا اتفاقہ آگ لگ جانے سے عمارت کا ایک بازو برباد ہو گیا۔ اس وقت سے یہ بے کار و غیر آباد پڑی ہے مگر کچھ برہمی جلی معلومات ہم پہنچ سکتی ہے اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانے میں یہ کمال شان و شوکت کی عمارت ہوگی کہ

بندر کے بالا حصہ میں شاید سب سے محفوظ و سالم عمارت وہاں کی مسجد ہے جس کا طول ۲۰۵ (اور متحف) عرض ۷۷ فیٹ ہے۔ ۱۹ محرابی دروازہ اور اندر اسی دور پائے (۱۱۰ م فیٹ قطر کے) بنا کے ان پر چھت قائم کی ہے۔ وسط میں محرابوں اور تین زینے کے منبر کو لئے ہوئے ۳۰ مربع فیٹ کا مقصورہ ہے یہاں چھت سے اوپر ایک مشن درجہ اٹھا کے اس پر ایک ٹراگنید بنایا ہے۔ چھت پر کوئی ۴۰ چھوٹے گنبد اور بھی تھے مگر اس کے کئی حصے گر پڑے ہیں۔ شہر کے باہر تقریباً پانچ میل شمال مشرق میں بہمنی بادشاہوں کے دس مقبرے بھی اسی طرز

۱۔ مرکز کا ترجمہ فرشتہ - دوم ۵۱۰

کے خاصے شاندار نے ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا احمد شاہ کا مقبرہ ہے جس نے  
 ۱۷۵۷ء وفات پائی۔ ان میں آبائش و زیائش کا کوئی خاص استقام نہیں کیا گیا  
 ہے مگر ساخت عمدہ اور زبردست آثار زیر رقبہ دار تقاع سے عظمت برستی ہے یہ  
 برید شاہیوں کے گنبد بھی (جنھوں نے ۱۷۹۲ء سے ۱۷۹۹ء تک حکومت  
 کی) کافی شاندار اور دست میں گو لکندے کے گنبدوں کا مقابلہ کرتے ہیں اس  
 خاندان کے دوسرے بادشاہ اہیت برید (۱۷۵۷ء تا ۱۷۵۸ء) کا مقبرہ شہر  
 کے مغرب میں کوئی آدھے میل کے فاصلے سے ایک وسیع اور مضبوط چبوترے پر  
 تقریباً ۷ فیٹ مربع بنا ہوا ہے اس کی دیواریں ۹ فیٹ ۸ انچ چوڑی اور  
 چبوترے کے اوپر ۷ فیٹ اونچی چلی جاتی ہیں۔ ان کے سرے پر خوشنما کنگورو  
 کا حاشیہ بنا دیا ہے رگنبد کی بلندی ۲ فیٹ ہے۔ اندر سے چھین پتھروں کی  
 پیٹیاں ڈال کے اس کی شان بڑھائی اور خط طغرلی میں عربی کلمات سے  
 تزئین کی ہے

۱۷۵۷ء کے متعلق مزید معلومات کے واسطے دیکھو آرکیولوجیکل سروے آف ویٹرن انڈیا "جلد سوم و  
 (حال میں سرشتہ آثار قدیمہ سرکار عانی نے اس پر ایک مستقل رسالہ شایع کیا ہے۔ مترجم)

# باب نہم

## بیجا پور

جامع مسجد - ابراہیم و محمود کے مقبرے - دیوان عمام -  
مہتری محل - گولکنڈے کے گنبد - نواب امیر خاں کا مقبرہ -  
سنین

۱۷۹۰ء	یوسف عادل شاہ
۱۸۱۰ء	اسٹیل عادل شاہ
۱۸۳۲ء	مہر عادل شاہ
۱۸۳۵ء	ابراہیم عادل شاہ اول
۱۸۵۴ء	علی عادل شاہ اول
۱۸۸۰ء	ابراہیم عادل شاہ ثانی
۱۹۲۶ء	محمد عادل شاہ
۱۹۵۶ء	علی عادل شاہ ثانی

جیسا کہ اوپر بیان ہوا انگریزوں کے کاہلی خاندان دہلی کی مرکزی سلطنت  
یا دکن کی کسی اور ہمسفر مملکت کی مدد لئے بغیر خود ہی ڈیڑھ صدی تک جنوب  
کی ہندو ریاستوں سے آویزش و پکارس میں مصروف رہا لیکن پندرہویں صدی کے  
ختم سے پہلے اس میں اسی زوال و کمزوری کے آثار نمایاں ہونے لگے جو تمام

ایشیائی بادشاہوں کا طبعی خاصہ ہے۔ اور کن تھا کہ ہندو ریاستیں کم سے کم بندھیاں تک پھر آزاد و خود مختار ہو جائیں کہ اتنے میں یوسف عادل خاں کی شکل میں ایک نیا اور قومی تر حریف میدان میں آگیا جسے سلطان ترکی مراد ثانی کا بیٹا خیال کرتے ہیں۔ اس محاف سے وہ خاص ترک تھا اور استنبول میں اس کی ولادت ہوئی اگرچہ اس کی ماں کو شیر خوارگی ہی کے زمانے میں اسے مجبوراً وہاں سے باہر بھیج دیا پڑا۔ گردش روزگار کے بہت سے تماشے دیکھنے کے بعد اسے تیدر میں امیر تید کے لئے خرید لیا گیا اور فوج رکاب میں خدمت پاک کے وہ بہت جلد اتنی ترقی کر گیا کہ سلسلہ میں دستور دینا نے تخت کھائی تو یوسف عادل خاں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بجا پور کی عادل شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی لیکن نئے خاندان شاہی کے سچاس ساٹھ سال بقا کے لئے سمیت نگہداشت میں گزرے اور عادل شاہی سلاطین کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ ہمیشہ در زمین کی طرف توجہ کر سکتے۔ ان کے پائے تخت کا مہلی در تعمیر علی عادل شاہ کی بادشاہی (سلسلہ) سے شروع ہوتا ہے۔ اور تمام مشہور و معروف عمارات کی بنیاد اسی سو برس کے اندر پڑی جو تسلی کی تخت نشینی اور عالمگیری محاربات کے درمیان کی صدی ہے جس کے بعد اس بادشاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور اس سلسلہ ہی زمانے میں ان کا پائے تخت ایسے سلسلہ عمارات سے مزین ہو گیا جو اسی قدر ممتاز ہیں جس قدر ہندوستان کے کسی دوسرے اسلامی پائے تخت کی عمارتیں۔ اور اس قول سے اگر وہ۔ ودہلی کو بھی کبھی مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے پھر ساخت کی جدت کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ عمارتیں اسی عجیب ہیں کہ جو بنور و محمد آباد جیسے مقامات کی عمارتیں بھی ان سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ حالانکہ ان کا طرز عمارت ان عمارتوں سے بہت کچھ مختلف ہے۔

یہ فیصلہ کرنا سہل نہیں ہے کہ اس جدت کا سبب عادل شاہیوں کا نور نغداد اور ہر ہندی شے سے متفرق ہونا تھا، یا ایسے مقامی اثرات سے جن کو اب ہم صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے، یہ فرق پیدا ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا فیصلہ سے ہونا اور سنت اجماعت فرقے کی بجائے ایران کے شیعہ عقائد کی طرف میلان اور

اہل ایران کو شوق سے اپنے ہاں عہدے دینا ان سب نے مل کر عادل شاہی طرز تعمیر پر ہی اثر ڈالا اور اس میں رفعت و شان اور وسعت و فراخی کی خصوصیات پیدا کی ہوں۔

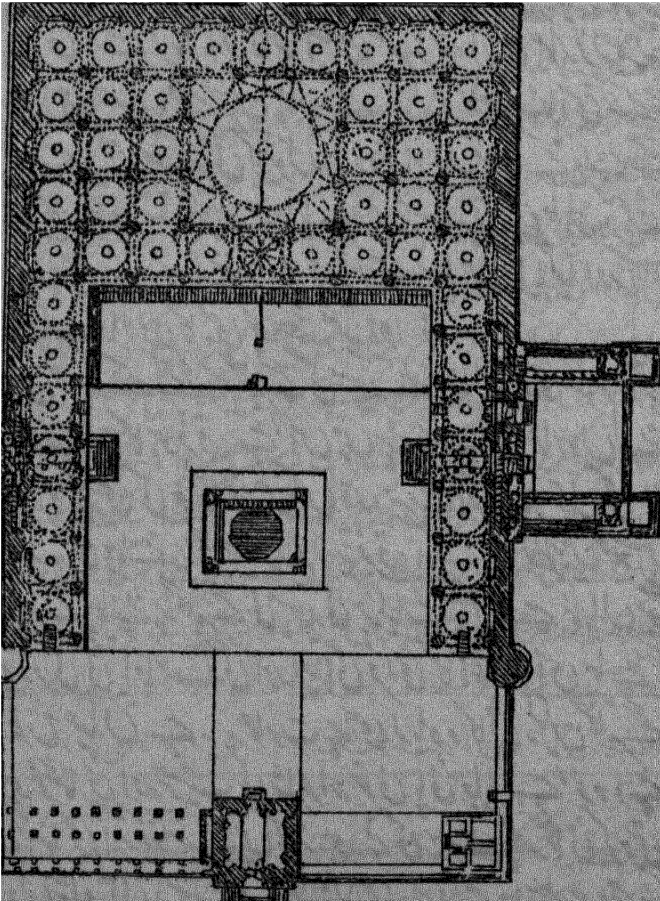
عادل شاہوں سے پہلے مسلمان فاتحین نے کرم الدین کے ماتحت ۳۱۶ھ کے قریب جیلاؤر کے قلعے میں ایک مسجد بند دکھنڈروں کے طے سے تعمیر کی تھی۔ اس میں جوستون لگے ہوئے ہیں، یکس حد تک دوسری عمارتوں سے لئے گئے اس بارے میں ہیں کچھ علم نہیں ہے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کا ایک حصہ کسی ہندو مندر کے پیش والاں کا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ دوسرے اجزاء بھی اور جگہ سے ہٹائے ہوئے موجودہ صورت میں مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ ایک اور قدیم مسجد خواجہ جہاں کی ہے جو پندرہویں صدی کے اخیر میں تعمیر ہوئی اور ہندو مندر سے ملتی جلتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی پرانے مندروں کے لیے سے بنایا گیا ہوگا۔ اس میں جس وقت نئے خاندان شاہی کو عمارات پر توجہ کرنے کی فرصت میسر آئی تو انہوں نے ہندی ادھار اور ر صنعی کی نقل کرنے کے خیال کو کلیتہً ترک کر دیا اور اپنی نیکی کی کمان یا قبے کا خاص طرز اختیار کیا اور اس میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

جام مسجد، جو شہر کی قاعدے کی عمارتوں میں ایک قدیم عمارت ہے، علی عادل شاہ نے ۱۵۵۵ء تا ۱۵۵۷ء عمارت بنانی شروع کی اور گو اس کے جانشین بھی اسی نقشے پر بناتے رہے لیکن حقیقت میں وہ آخر تک مکمل نہ ہو سکی بلکہ اس بادشاہی کا چراغ گل ہوا تو اس وقت بھی صدر دروازہ اور صحن کا

سے تیار ہو اس معاملے میں خاص طور پر خوش نصیب ہے کہ اس کے آثار قدیمہ کا مال ذمہ کثرت سے بلکہ نہایت خوبی سے بالقصور معرض تحریریں آتا ہے۔ کپتان ہارٹ کی نگارنی میں لگاتار اس کی عمارتوں کے جو خاکے اور نقشے آتارے ہیں وہ صحن نقاشی اور صحت کے اعتبار سے بے نظیر ہیں۔ میں نے انہیں ۱۵۵۵ء میں پیر سرکار کے غریب سے لہور پھر پیرس ایشیائے قدیمہ مغربی ہند کی طرف سے بعض مناظر کی تصاویر کے اضافے کے ساتھ ۱۵۵۵ء میں چھپوایا تھا۔



جو تھا رخ ناتمام تھا۔ اس کے باوجود یہ ہندوستان کی بہترین مساجد میں داخل ہے۔  
 جیسا کہ ذیل کے خاکہ سے ظاہر ہو گا، مکمل ہو کے یہ ۲۳۱ x ۲۵ فٹ کی مستطیل عمارت ہوتی۔ صدر عمارت اب بھی مکمل ہے اور ۲۵ x ۱۴۵ فٹ یعنی تقریباً ۳۷ ہزار مربع فٹ کے رقبے پر بنی ہوئی ہے۔ گویا بجائے خود گلبرگے کی مسجد کے برابر ہے اور پہلوؤں کے دالان جو ۱۸۶ فٹ آگے بڑھے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ ہیں۔ اسی طرح اگر یہ مسجد



مکمل ہو جاتی تو قرونِ وسطیٰ کے ایک بڑے کلیسائے کے برابر وسیع ہوتی۔ لیکن

اس کی صنعت و ترتیب سے بھی بڑا دلکش چیز اس کی متاعی ہے اس کے ہر مربع پر نہایت خوشنما گنبد بنے ہوئے ہیں مگر اوپر سے انہیں اتنا چھٹا رکھا ہے کہ باہر سے چھت کی مٹائی کے اندر چھپ گئے ہیں۔ اس قسم کے بارہ وسطی مربعوں پر ایک بڑا ۷۵ فیٹ کے قطر کا گنبد ہے اور خود جس مربع پر وہ قائم ہے اس کا ہر پہلو ۷۵ فیٹ بنتا ہے۔ محمد عادل شاہ کی قبر پر ۱۲۴ فیٹ قطر کا جو عظیم الشان قبہ اسی نقشے پر بعد میں بنا، وہ اس گنبد سے کہیں زیادہ وسیع و رفیع ہے لیکن کمتر عرض و ارتفاع کے باعث یہاں معمار کو موقع مل گیا کہ نسبتاً زیادہ ممتاز و دلکش خطوط نمایاں کرے اور اگر وہ گنبد کے قاعدے کی ٹیاں چیر کر ان میں درتچے بنانے کی ہمت کر جاتا تو غالباً اس قسم کی ساری عمارتوں میں اجور دہ عالم پر موجود ہیں، سب سے حسین عمارت بنانے کا شرف اسی کے حصے میں آتا ہے۔

اصحن مسجد کے مشرقی گوشوں پر دو مینار بنائے جانے والے تھے لیکن صرف شمالی کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز ہونے پایا۔ بعد میں مشرق کی طرف صحن ۹۵ فیٹ بڑھا کے ایک وسیع دروازہ سانے والے رخ کے وسط میں بنایا گیا اور اس کے جنوب میں ایک دالان کا بھی کچھ حصہ تعمیر ہوا۔

اس مسجد کے نقشے کا کلہر گے کی مسجد سے مقابلہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ان کے درمیان ڈیڑھ صدی کا جو فرق ہے اس میں ہندوستانی معماروں نے ساخت کی صفائی اور کاریگری کی خوشنمائی میں کس قدر حیرت انگیز ترقی کی ان دونوں کے خاکے ایک ہی پیمانے پر بھیجئے جائیں تو یہ فرق ایک ہی نظر میں محسوس ہو جائیگا لیکن ایک چھوٹے پیمانے پر کلہر گے کی مسجد کی جزئیات شکل سے نمایاں ہو سکتی ہیں۔

سجالیکہ بیجا پور والی کی باقاعدگی اور اجڑا کی فراخی کا اندازہ اسی پیمانے کے خاکے سے پوری طرح عیاں ہے۔ یہ عمارت ہے بھی زیادہ کمال لیکن کلہر گے کی قدیم مسجد میں جو خوشنمائی اور ترتیب کی شاعرانہ خوبی پائی جاتی ہے، وہ اپنے جدید تر حریف سے صناعی اور نفاست میں کم تر ہونے کی بہت کچھ ثنائی کر دیتی ہے۔

عادل شاہ ثانی (۱۷۵۷ء تا ۱۷۶۷ء) نے اپنے واسطے جو مقبرہ بنانا شروع کیا، وہ بہت بلند مربع کرسی پر ہے جس کا ہر پہلو ۲۱۵ فیٹ ہے اگر یہ مقبرہ

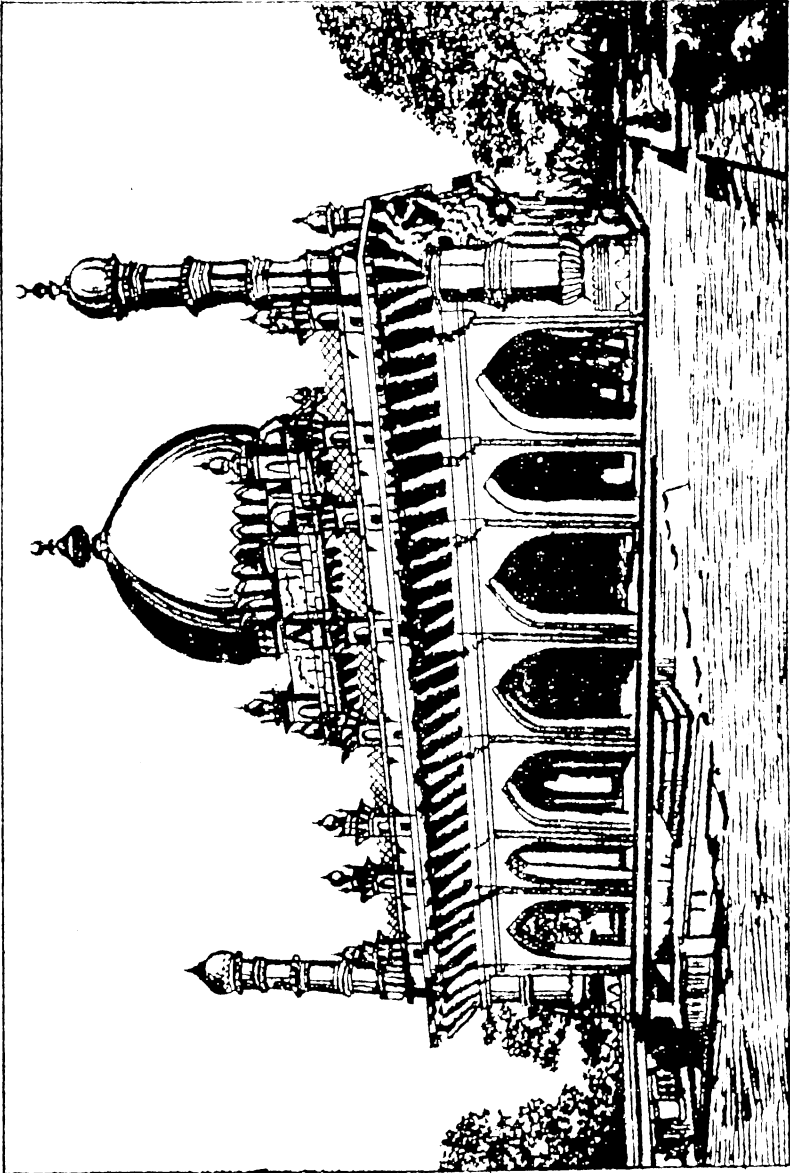
اصلی نقشے کے مطابق مکمل ہو جاتا تو ہندوستان کے بہتر سے بہتر مقبرے کی شکل کا ہوتا۔ اس کا وسطی کمرہ ۹ فٹ مربع ہے اور اس کے ہر طرف دہرے والان بنے ہوئے ہیں جس کی محرابیں غوطی طرز کی طرح دو مرکزوں سے اٹھائی اور گولائی دے کے تختی پر ملا دی ہیں۔

تورانی رواج کی خرابی یہ ہے کہ ہر بادشاہ جو اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ تعمیر کرتا ہے، اگر اس کی تکمیل سے پہلے فوت ہو جائے تو وہ ادھوار رہ جاتا ہے مگر جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ زندگی میں بنانا شروع نہ کرے تو پھر بہت ممکن ہے کہ اس کے پسپا نہ ہونے کو اس کی کوئی قابل دید یادگار باقی رہے۔

علی عادل شاہ ثانی کے دادا ابراہیم ثانی (۱۵۷۹ء تا ۱۶۲۶ء) نے اپنا مقبرہ ایسے محدود پیمانے پر (یعنی کل ۱۱۶ فٹ مربع) بنایا تھا کہ جب وہ عرصہ دراز تک قبیل مندی کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا، تو اس عمارت کو اپنے اپنی عزیز ملکہ اور اقربا کے شایان شان بنانے کی صورت یہی رہ گئی کہ اس کی آرائش و زیبائش کا پورا اہتمام کیا جائے جنانچہ عمارت کے ہر حصے پر اس تکلف کی نگارگری اور سنگ تراشی کی ہے جس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ خطاطی کے کتبات اس کثرت سے کھومے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے کہ پورا قرآن شریف دیواروں پر مرصع ہے۔ کنکنیوں کے نیچے بڑے تکلف کے توڑے اور دیوار گیریاں لگائی ہیں۔ درجوں میں جاتی کا نفیس کام کیا ہے۔ غرض ہر حصہ صنایع سے اس درجہ معمور ہے کہ اگر کارگر ہندوستان کے چابک دست لوگ نہ ہوتے تو اس میں بھڑک اور بدنمائی آجاتی۔ تصویر میں ہم نے اس

سلطنت ابراہیم کی قبر کے ایک طرف اس کی عزیز بیٹی زہرہ سلطانہ اور دوسری طرف ماں کی قبر ہے اور اس کے برابر بادشاہ بیگم تاج سلطانہ مدفون ہے۔ کتبے میں یہ روضہ اسی ملک کی یادگار بتایا گیا ہے۔ باقی دو قبریں بادشاہ کے بیٹوں کی ہیں۔

دلکش مقبرے کی مشرقی روکار دکھائی ہے جو



تعمیر لوح بنیت

مقبرے میں بڑا کمرہ مربع اور اس کا ہر پہلو ۴۹ فٹ ۱۰ انچ ہے۔ اس پر  
تچھر کی چھت دکائی ہے اور بیچ میں بالکل سپاٹ پٹیاں کور سے کور ملا کے جمادی ہیں

جن کے نیچے صرف ایک چھبھے کا سہارا ہے جو ہر جانب دیوار سے ، فیٹ ، اونچ آگے نکلا ہوا ہے ۔ باقی تمام سپاٹ چست کس چیر پر لگی ہوئی ہے یہ وہ بھد ہے جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو واقف ہوں کہ ہندوستان میں چرنے کے دو چھو اور عمدہ گچ سے کیسے عجیب عجیب کام لئے جاتے ہیں پڑاؤں کمرے کے اوپر ایک اور کمرہ گنبد کے اندر بھی اسی نیچے والے کی طرح آرائشی بنا دیا ہے ۔ جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ قبے کی متناسب بلند ہی سے عمارت میں خوشنمائی پیدا ہو جائے ۔ دیوار کے آثار میں ایک تنگ و تاریک سائزینہ بنایا ہے کہ اس حجرے کے اندر تنگ پہنچ سکیں ۔

مقبرے کے ساتھ جواب میں ایک اتنی ہی خوبصورت مسجد بنائی ہے ۔ اور یہ عمارتیں جس شاہی باغ کے اندر ہیں ۔ یہی حسب معمول فوارے ، گلاباڑیاں وغیرہ بنا کے زیب و زینت بڑھائی ہے اور باہر کے رخ لنگر خانے ، مسافر خانے وغیرہ بنے ہوئے ہیں ۔ غرض یہ کل مجموعہ ایسا ہی پر تکلف اور خوش منظر ہے جیسی ہندوستان میں اس قسم کی بہترین عمارات ہیں اور استنبول کے ( مغرب ) پا کی عمارتوں سے تو کہیں بڑھ چڑھ کر ہے ۔

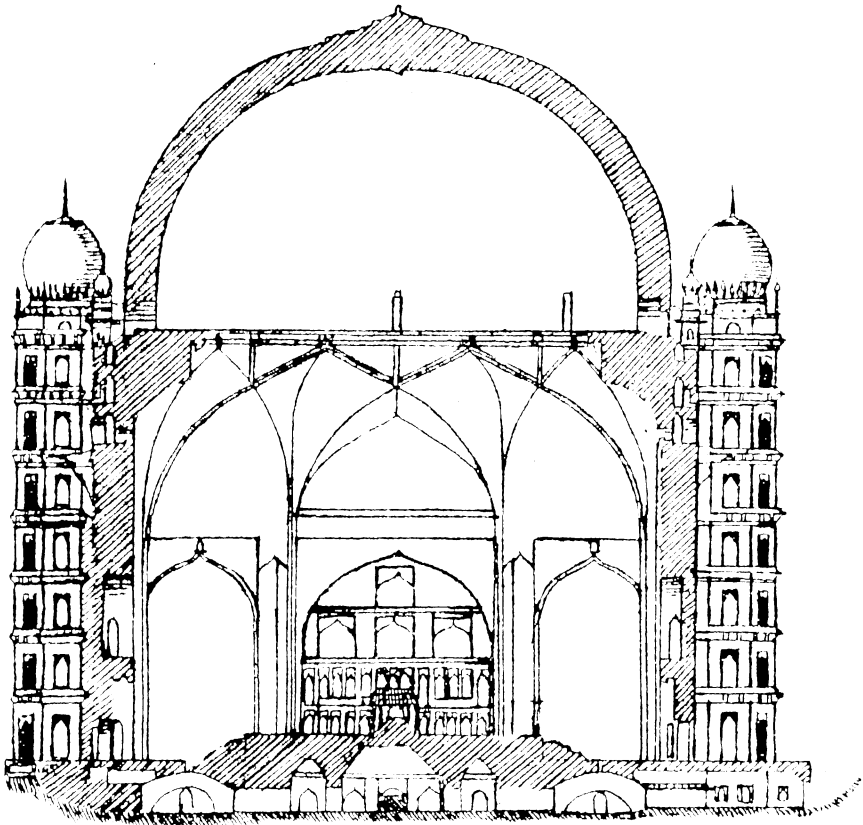
اس بادشاہ کے جانشین محمد ( ۱۶۲۶ء تا ۱۶۵۷ء ) کا مقبرہ نقشے کے اعتبار سے مذکورہ بالا مقبرے سے بالکل متضاد سمجھنا چاہئے ۔ ابراہیم کے مقبرے کی خصوصیت باریک کام کی کثرت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ باقی بڑی بڑی عمارتوں کو لے کر محمد عادل شاہ کے مقبرے کا امتیاز اس کی بڑائی اور سادہ عظمت ہے ۔ پوجا پور کی بڑی مسجد کا گنبد جس ہول پر بنایا گیا ہے ۔ یہ مقبرہ بھی اسی ہول پر تعمیر ہوا لیکن اتنے بڑے پہنے پر کہ فن تعمیر کا اہماز ن گیا حالانکہ مسجد کا مذکورہ بالا گنبد محض ایک عملی عمارتی نقشے کا بروئے کار آجانا تھا ۔

خاکے سے معلوم ہو گا کہ اندر سے یہ ایک مربع مکان ہے جس کا ہر ضلع ۳۵ فیٹ ۵ انچ رکھا گیا ہے ۔ اس طرح رقبہ ۱۸۲۲ مربع فیٹ ہوا اور اس کے مقابلے میں شہر رومہ کے پانچ تینوں کی اندر سے پیمائش صرف ۱۵۸۲ مربع

فیٹ ہے۔ دونوں عمارتوں کی دیواروں میں جو خلا چھوڑے ہیں ان کا حساب لگانے کے باوجود ان دونوں میں یہ مقبرہ ہی زیادہ بڑی عمارت ہے تو ۷۰ فیٹ کی بلندی پر نہایت ہی نادر و خوشنما چھڑکوں کا سلسلہ اندر کے رخ نکالا اور ان سے ایوان کو دائرے کی صورت میں تنگ کر دیا ہے کہ اس کا قطر یہاں ۹۰ فیٹ رہ جاتا ہے۔ پھر ان چھڑکوں کی بالائی چھت پر جو فرش سے  $\frac{1}{4}$  ۱۰۹ فیٹ اونچی ہے گنبد اٹھایا ہے جس کا قطر ۲۴ فیٹ ۵ انچ ہے اور اس طرح بیچ میں ۱۲ فیٹ چوڑی ایک غلام گردش چھوڑ دی ہے۔ جو اندر سے پورے گنبد کے گرد گزرتی ہے تو اندر کے فرش سے نائے تو گنبد کی بلندی ۸۷ ۱۰ اور باہر کے چوترے سے نیچے تو ۹۸ فیٹ ہے۔ نیچے اس کا آثار دس اور اوپر کھلی پر پہنچ کر نو فیٹ رہ گیا ہے تو سب سے بڑا کمال اور حدت جو اس گنبد کی ساخت میں دکھائی ہے وہ اس کے جناحی یا بیرونی لداؤ کو تھانے میں ہے کہ اندر کے چھڑکے اس طریق سے بنائے ہیں کہ ایک طرف تو آثار کے زادے ان پر قائم ہو جاتے ہیں اور دوسرے ان کی کمانیں ایک دوسرے سے آکے مل جاتی ہیں اور بجائے خود نہایت مضبوط اور خوب چوڑی عمارت بن گئی ہیں۔ ان کا اندر کے رخ ہونا گنبد کے وزن کو باہر کی طرف ڈھلکنے سے روکتا ہے اب اگر اس توازن کی عمارت چال کرے بھی تو اس کو اندر کے رخ گرنا چاہیے جو اس کے مدور ہونے کے باعث غیر ممکن ہے اور اوپر چھڑکوں کا وزن گنبد کے مخالف سمت میں ہونے کے باعث یہ ایک گرہ سی لگ گئی ہے جو پوری عمارت کے توازن کو تھامے ہوئے ہے اور گنبد کی خوشنمائی اور ظاہری صورت میں بھی کوئی خلل نہیں پاتا۔

پان تھیوں اور یورپ کے اکثر گنبدوں میں ڈھلاؤ پر اتنی زیادہ چٹائیوں کر دیتے ہیں کہ بیرونی صورت ہی چھپ جاتی ہے اور حقیقت میں اندر کی طرف بوجھ دے کے نفاست کے ساتھ توازن قائم کرنے کے مقابلے میں یہ مغربی طریقہ عجیب ہے ڈھنکا اور بھدا ہے۔ دوسرے بجا کوری گنبد کو جہاں اس تدبیر سے ایسی مستحکم بنیاد ہم پہنچ گئی ہے کہ اس پر گنبد بے تکلف استادہ رہ سکتا ہے

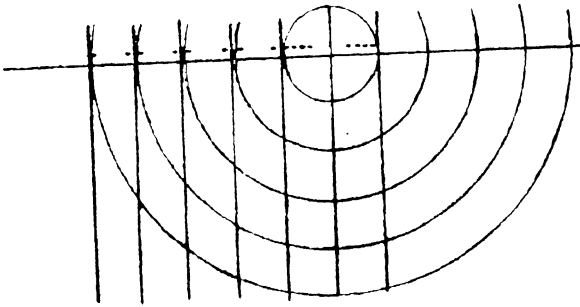
اور کسی ڈھلاؤ سے اس کے چال کر جانے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا، وہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اس کی ساخت پر نظر ڈالیں تو بظاہر عقل میں نہیں آتا کہ یہ گنبد قائم کیونکر ہو سکتا ہے۔ ذیل کے نقشے پر غور کیجئے کہ۔



تصویر نمبر ۲۱۶

اگر یہ کسی محراب یا لداؤ کی چھت کا نقشہ ہوتا تو عمارت ایک گھنٹے بھی کھڑی نہ رہ سکتی تھی لیکن خود گنبد کو دیکھئے تو اسے ایسی تدبیر سے بنایا ہے کہ جس طرح یہ تدبیر معمولی محراب یا لداؤ کے واسطے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، قریب قریب اسی طرح گنبد کے بنانے میں کبھی ناکامیاب بھی نہیں رہ سکتی، چونکہ صنعت کے اعتبار سے بھی آج تک چھت کی سب سے خوشنما صورت گنبد ہی ایجاد

ہوئی ہے، لہذا مناسب ہوگا کہ بیجا پور کے اس عظیم الشان قلعے کا جو اس وقت تک دنیا کا سب سے غیر معمولی اور عجیبہ ترین ساخت کا گنبد ہے، ذکر ختم کرتے وقت ہم گنبد سائمی کے اصول پر ذرا تفصیل سے غور و بحث کریں۔ فرض کیجئے ذیل کی شکل ایک بائٹل چمٹے گنبد کا خاکہ ہے جس کا قطر سو فیٹ اور سہم یا پٹیاں دس دس فیٹ چوڑی ہیں۔ اب سہولت کی غرض سے فرض کیجئے کہ کل گنبد کا وزن ۸۵۰ ٹن ہے۔ اس صورت میں بیرونی پچی ۲۸۲۶ ٹن کی یا



تصویر نمبر ۴۸

اندر کی کھنٹی تین پٹیوں کے وزن کے برابر ہوگی۔ دوسری ۲۲۰ ٹن تیسری ۱۵۶ ٹن کے بعد کی ۹۴ اور اندر کی صرف ۳۱ ٹن وزن کی ہوگی۔ گویا اس آخری یا اندر کی دو پٹیوں کی دبازت زیادہ کھنٹی پڑے گی اور یہ بھی اہم تمام کرنا ہوگا کہ اس زائد دبازت سے گنبد کی مضبوطی پر برا اثر نہ پڑے لیکن حقیقت میں یہ خواہی نخواہی کی دشواری پیدا کرنا ہے اور ہمیں اس مفروض کی بجائے گنبد کو نیم گردی یا اس کرنا چاہیے جس کا پہلا سہم عرض میں صرف دس لین بلندی میں ۲۰ فیٹ اور وزن میں ۹۴ ٹن ہوگا۔ دوسرے کی بلندی ۱۰، تیسرے کی ۶ فیٹ ہوگی ان کا وزن بھی علی الترتیب ۳۱، ۸۸ ٹن ہوگا چوتھا سہم ۹۴ اور مرکزی حصہ پہلے مفروضہ گنبد کی آخری پٹی کی مثل صرف ۳۱ ٹن کا ہوگا۔ اب اس نیم گردی گنبد کا سب سے پہلا سہم جو سب سے سیدھا



واقع ہوا ہے ظاہر ہے کہ اس کے ٹھکانے یا چال کرنے کا احتمال سب سے کم ہے اور چونکہ گنبد کا دو تہائی وزن یہیں ہے لہذا اسے مضبوطی سے درست تعمیر کر دیا جائے تو باقی ایک تہائی وزن کو پورے ہی طرح سنبھال سکتا ہے جس میں باقی سارا گنبد بنا ہوا ہے۔

اور زکریا کی شکل یا کسی گنبد کے اصلی خاکے کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سہم کو گنبد کے قاعدے سے مضبوط اٹھانا سہل بات ہے اور جب یہ قوت کے ساتھ اچل بنیاد پر بن گیا تو پھر مہار باقی حصے کو جس طرح چاہے ڈھال سکتا ہے اور کوئی بہت ہی اناری مہار ہو گا جو اسے بخوبی سنبھلے رہنے کے لائق نہ بنائے۔ ہمالک مشرق میں تو کاریگروں نے عجیب عجیب وضع سے ان گنبدوں کو بنایا ہے اور تعمیر ہی قواعد سے کہیں زیادہ خوشنما کی کا لکا لکھا کیا ہے باوجود اس کے شاذ و نادر ہی کوئی نظیر اس امر کی ملے گی کہ تعمیر کے نقص سے کوئی گنبد گر پڑا ہو۔

برخلاف مشرقی مہاروں کے، یورپ کے مہار گنبد بنانے میں ہمیشہ کے کم سمیت اور اناری تھے البتہ اب ہمارا علم اتنا ترقی کر گیا ہے کہ مہر عادل شاہ اس گنبد سے بھی کہیں بڑے گنبد بلا خطر اور زیادہ دلیری کے ساتھ بنانے آسان ہوں گے۔

یہ عمارت اندر سے جتنی خوبصورت ہے اسی قدر سن اس کی بیرونی آرائش میں پایا جاتا ہے۔ ہر زاویے پر ایک دشمن برج، اچھ منزل کا بنایا ہے جس کے اجزاسادہ اور نہایت رفیع الشان ہیں اور سب سے اوپر بہت ہی نفیس و خوشنما قہ بنادیا ہے۔ عمارت کا زیریں حصہ سادہ اور سنگین ہے اور اس میں مناسب روشنی اور ہوا کے واسطے صرف روشندان چھوڑ دیئے ہیں۔ ۳۸ فیٹ کی بلندی پر دیوار کے آگے ایک چھوٹا ۱۲ فیٹ چوڑا نکالا ہے اور یہ چوڑائی اس قدر ہے کہ یورپ کے کسی باہمت سے باہمت مہار نے بھی اس کے نفع سے زیادہ عرض تھا چھوٹا چھوٹا نہیں بنایا کیا۔ اس کے اوپر ایک کھلی ہوئی غلام گردش پوری عمارت کو زہت و تکمیل بخشتی ہے اور اس کے ہر رخ پر دو چھوٹے چھوٹے

مینار بنانے کے مزید خوشنمائی پیدا کر دیکھی ہے۔  
 دوسری سرکاری عمارتوں میں بھی بجا پور کے مہاروں نے ایسی  
 اولوالعزمی دکھائی ہے۔ مثلاً وہاں کے دیوان عام یا لکھن محل (۱۵۶۱ء)  
 کی وسطی محراب ہی ۶۰ فٹ ۹ انچ عریض ہے اور اگر آگے تو اچھی طرح  
 نکلی ہوئی ہوتی تو بجائے خود فن تعمیر کی ایک یادگار چسپڑ بھی جانی  
 بحالت موجود اس میں صرف مہار نے اپنا کمال دکھانے کی کوشش کی ہے اور  
 اس لیے زیادہ کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ اس کا سائبان یا چھجہ چولی تھا جس کے  
 بعض ٹیکے اب تک اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ یہ بھی بجا پور کی خصوصیت ہے کہ  
 گوہندوستان کے دوسرے مقامات میں چھتوں کو لکڑی سے بنانے کا رواج  
 مدت سے متروک ہو چکا تھا مگر اننگستان کی طرح (برابر چوبی سائبان وغیرہ) نئے  
 رہے۔ آثار مبارک یا آثار محل کی عمارت بھی ایک طرف سے بالکل گھلی  
 ہوئی ہے اور ساری چھت صرف دو چوبی ستونوں پر جن کے اوپر بڑی دیوار گیلیں  
 بنا دی ہیں قائم ہے۔ اندر بھی تمام آرائشی کام چوبی کیا ہے۔ اس طریقے سے  
 بجا پور میں بھی وہی عمدہ نتیجہ برآمد ہوئے جو اننگستان میں ہوئے تھے کہ  
 زیادہ عریض چھت بنانے میں سہولت ہو گئی اور تعمیر زیب و زینت میں کہیں  
 زیادہ تکلف و محمل سے کام لیا جانے لگا۔ دوسری یہ ضرورت نہ رہی کہ عمارت  
 کا بھدّا بھدّا ہونا بھی چاروں اچار گوارا کیا جائے۔

شہر کی عمارات میں ایک سات منزل کا محل سات منزلہ نامی ہے۔  
 اس قسم کی عمارتیں دنیا کے دور دست گوشوں میں عجیب طرح ہمارے سامنے  
 آتی رہتی ہیں اسی کے ساتھ آثار مبارک کے محل کو شامل کر لیجئے جسے مسلمانوں  
 نے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہوئے مبارک کی درگاہ قرار دے لیا ہے  
 تو اندازہ ہوتا ہے کہ آثار یوں کی عمارت کو ان کے نسلی تہنات سے جدا کرنے  
 مشاہدہ کرنا کس درجہ دشوار معاملہ ہے۔  
 ان دو کے علاوہ شہر نیاہ کے اندر پانچ محل اور تھے اور ان میں سے  
 بعض بڑی شان و شوکت کی عمارتیں تھیں۔ نیز امرا اور وہار کے متوسلین کے

صد ہا مکانات تھے مگر بیس سال ہوتے ہیں، حکومت ممبئی نے ان میں سے بہت سی قدیم عمارتوں کو جدید ضروریات کے موافق بنالیا۔ بنجار مسجد، ڈاک خانہ اور محمد عادل شاہ کے مقبرے کی مسجد سرکاری آرام خانہ (ریسٹ ہوس) بنائی گئی تھیں۔ یہ دونوں تو بعد میں واپس دے دی گئیں لیکن عدالت محل کو صاحب ضلع کا سکشن اور سونچ محل کو اس کے بیوتات قرار دیا گیا۔ چینی محل میں سرکاری دفتر آگئے۔ انست محل میں مددگار صاحب ضلع نے سکونت اختیار کی۔ یا قوت دہلی (۹) کا محل مسافر بنالیا گیا۔ خواہں خاں کے مقبرے اور مسجد میں صدر متہم تعمیرات کا مکان اور کچھ سی قائم ہوئی۔ جھوٹے چینی محل کو متہم صاحب کو توالی کا مکان قرار دیا گیا اور عرش محل، سول سرجن صاحب کی سکونت گاہ بن گیا۔

بیجا پور کی سب سے عجیب عمارتوں میں ایک دو ڈیوڑھی ہے جسے مہتری خانہ کہتے ہیں۔ یہ ہندی اور اسلامی مخلوط طرز کی بنی ہوئی ہے اور اس کے ہر گوشے اور چتے چتے پر صنایعی کی بے لیکن کہیں حسن تناسب اور نفاس کے اعلیٰ معیار سے گزرتی ہوئی نہیں۔ یہ ۲۴ فیٹ مربع اور تین منزل کی عمارت ہے جس کے سامنے چھت پر دو سبک دمے بنے ہوئے ہیں۔ نیچے کی منزل میں چاروں طرف دو درجے دیئے ہیں اور ان پر کمال خوبی سے سائیاں بنائے ہیں۔ پہلی اور دوسری منزل کی چابی اسی طریقے سے کی گئی ہے جیسی ابراہیم عادل شاہ کے روضے کی۔ محل میں یہ ایک مسجد کا دروازہ تھا اور ہندوستان میں اس سے بہتر ڈیوڑھی شاید کہیں نہ ہوگی اگرچہ عمارت کی خود یہ قسم کچھ اعلیٰ نہ سمجھی جائے۔

شہر کی زبردست تفصیل کا محیط  $\frac{1}{4}$  میل ہے جو بجائے خود ایک عظیم الشان کام ہے اسی کے ساتھ بانیوں کے مقبرے اور نواح بیجا پور کے کھنڈراں جو کبھی دنیا کے ایک بڑے شہر کا حصہ ہوئے، ملا کر دیکھئے تو عجیب شاندار ویرانی نظر آتی ہے جو ہندوستان میں ہر کسی جگہ کے آثار قدیمہ کی مد مقابل ہو سکتی ہے۔

۱۷ چھ منوئل جن دو ناخذوں کا ذکر آیا ان کے علاوہ مصنف کتاب نے ادارہ شاہی سہاران برطانیہ کی

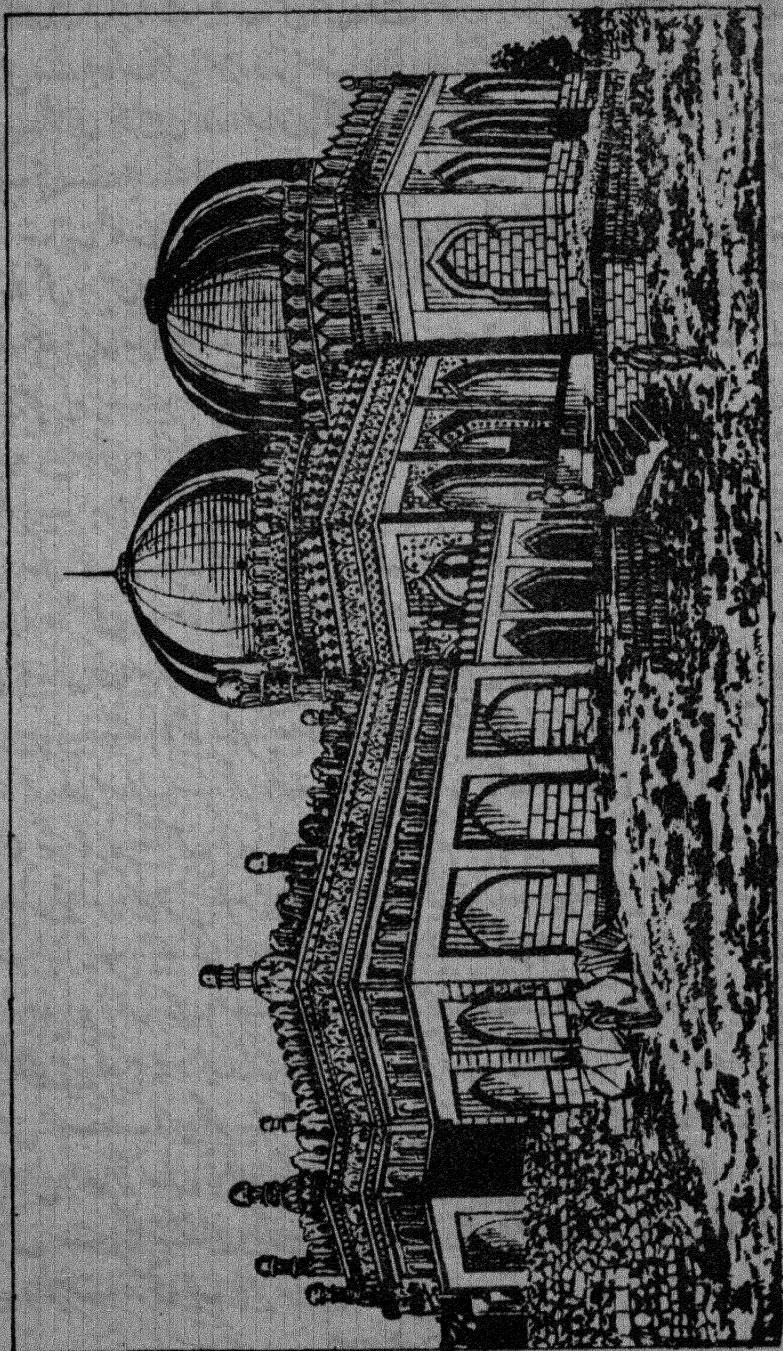
اگر کافی مواد میسر آئے تو تاریخی حیثیت سے یہ مطالعہ کرنا کمال محبسی کا موجب ہوگا کہ دکن کے شاہی خاندانوں نے جو ایک دوسرے کے بعد میدان میں آئے اور شان و شوکت میں اسلاف سے سبقت لی جانے اور اپنے اپنے صدر مقامات کو پہلے سے زیادہ آراستہ و پیراستہ کرنے کی کوشش کرتے رہے طرز تعمیر میں کیا کیا تبدیلیاں کیں لیکن بیجاپور کو چھوڑ کر باقی دکنی شہروں میں جو عمارتیں بنیں وہ اپنے ماحول اور تاریخی اہمیت سے قطع نظر، بجائے خود جہاں تک ہیں علم ہے حسن صنعت کی کوئی بہت خاص اور گراں بہا یادگار نہیں ہیں۔

خاندان شی کے فاروقی خاندان کا پائے تخت (مسئلہ ۵۹۶ء تک) برہانپور رہا اور یہاں بے شبہ وسعت اور عزت آمیزی کے اعتبار سے بعض آثار قدیمہ قابل لحاظ ہیں لیکن ان کی فنی قدر قیمت کم ہے اور بہت سی خاص کر زمانہ العہد کی عمارتیں حسن ذوق سے عاری نظر آتی ہیں۔ نظام شاہی خاندان کا صدر مقام مسئلہ ۵۹۷ء سے مسئلہ ۶۰۰ء تک احمد نگر رہا مگر اتنی با وقعت مملکت کا اتنے زمانہ تک مستقر حکومت رہنے کے باوجود اس کی عمارتوں میں تعمیری شان و شکوہ اس قدر کم ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ قطب شاہی خاندان کا پائے تخت مسئلہ ۶۰۰ء سے مسئلہ ۶۴۸ء تک لکنڈہ رہا جو شہر حیدرآباد سے میل شمال مغرب میں واقع ہے اس بادشاہی کی بناء محمود شاہ ثانی بہمنی کے ایک ترکمان یا ایرانی عہدہ دار علی قطب الملک نے ڈالی جو ترقی کر کے اضلاع تلنگانہ کا صوبہ دار ہو گیا تھا اور مسئلہ ۶۴۸ء میں خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اس خاندان کا تیسرا بادشاہ ابراہیم

بقیہ مانیہ صفحہ گزشتہ۔ رویداد (دسمبر ۱۵۹۸ء) کے لئے مضمون بیجاپور کی عمارتی عظمت و شان اور سلطان محمد عادل شاہ کے گنبد پر لکھے تھے۔ مسٹر کونز کی رہنمائی سے بیجاپور اس مسئلہ ۱۹۸۰ء میں رسالہ ہے مگر چند سال ہوئے، بیجاپور کی عمارات کی جو پائشیں انھوں نے کی تھیں ان کے تاج بھی تک شائع نہیں ہوئے۔

بڑا عمارت گر گزرا ہے، ملک بھی اس وقت آسودہ و سرسبز تھا۔ اسی کے نیٹے  
 محمد قلی نے بھاگ نگر یا موجودہ نصف جاہی پائے تخت میں در آباد کی بنا ڈالی۔  
 قطب شاہی سلاطین اور اعیان املہ کے مقبرے فیصل کے باہر جانب شمال مندرجہ  
 قریب ہی بنے ہوئے ہیں اور وسعت و خوشنماہی کے اعتبار سے بہترین مجموعہ  
 عمارات میں شمار ہونے کے مستحق ہیں اور اگر ان کی ٹھیک ٹھیک کیفیت بیان  
 کرنے کی غرض سے کافی مواد میر آئے تو ضرور اس قابل ہیں کہ تاریخ میں ایک  
 ممتاز جگہ پائیں۔ یہ بہت مقام پر اور ہر مقبرہ بہت اونچے جو کور چوڑے کے  
 اوپر تعمیر کیا گیا ہے اور ہر ایک کے ساتھ مصلیٰ یا ایک چھوٹی مسجد ہے جن میں  
 سب سے وسیع و خوشنما مقبروں میں محمد قلی قطب شاہ کا گنبد ہے جو ۱۵۷۱ء  
 کے قریب تعمیر ہوا۔ اس کی بڑی منزل پر نہایت خوبصورت حاشیہ بنایا ہے۔  
 اور پورے عمارت سے عظمت برتی ہے۔ ایک زمانہ میں اس پر بگین مینا کا کام  
 تھا اور اس کی صنایعی دیکھ کر تثنیٰ و نوحس نے ۱۶۶۷ء میں اسے دیکھا اور  
 اس کا حال لکھا، دنگ رہ گیا تھا، اپنی مقابر میں مناسب اجزا کی ایک لفز  
 عمارت چھٹے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء تا ۱۶۵۷ء) کا گنبد  
 ہے جس کی منزلوں کے گرد گنگوڑے اور گنگنیاں بڑی کارگر مین سے تیار کی ہیں  
 اسی کے قریب اس کی مان حیات بخش حکیم کا مقبرہ ہے جس کا ۱۶۱۷ء میں  
 انتقال ہوا۔ یہ ۶۵ فٹ مربع اور اسی طرز کی عمارت ہے جیسی عبداللہ قطب شاہ  
 کی۔ ان میں سے کئی مقبروں کی سرسالا جنگ مرعوم نے مرمت کرا دی تھی  
 شہر کی نواح میں املہ کے دربار کے اور بھی بہت سے مقبرے مختلف اوضاع  
 و اقطاع کے موجود ہیں جن میں سے دونوں کی ہم نے تصویر دے دی ہے۔  
 لیکن جب تک اس مجموعے کی پوری تصویریں کھینچ کر دریافت کے ساتھ  
 مفصل ان کا حال نہ لکھا جائے، ہم ان کی تیسرے در قیمت کا اندازہ  
 مشکل سے لگا سکتے ہیں اگرچہ اجمالی طور پر یہ معلوم ہے کہ یہ عمارتیں کافی  
 قدر و منزلت رکھتی ہیں۔

تصویر مجموعہ دیگر



سورۃ النبی

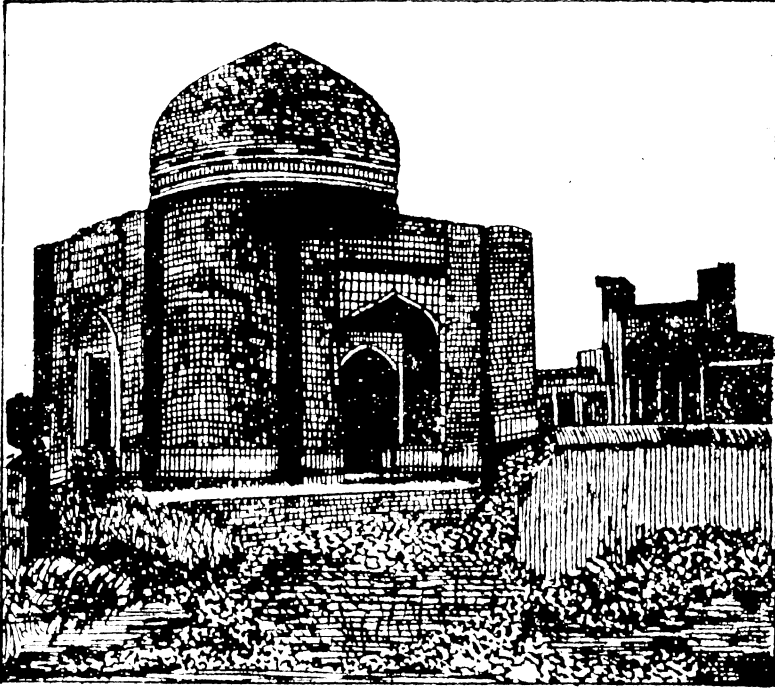
## ہندو

ہندوستان میں اسلامی فن کے طرز ہائے خورد میں ایک طرز ایسا ہے کہ اگر اس کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے کافی نمونے موجود ہوتے اور وہ اتنے قدیم بھی ہوتے کہ اس کا مغربی ملکوں کے طرز سے تعلق ثابت کیا جاسکتا، تو تاریخی اعتبار سے وہ بیان سب سے بظہر و بچہ ہوتا۔ جو محکم محل وقوع کے لحاظ سے سندھ قریب قریب ہندوستان کے باہر ہے لہذا اس صوبے کا ہمیشہ سے ایران اور دریائے سندھ کے پار کے ملکوں سے علاقہ رہا ہے۔ اگر اس کی عمارات کی تاریخ کا ہمیں علم ہوتا تو بہت ممکن ہے کہ ہم اکثر ادضاع و اشکال کے اصلی ماتخذوں کا جن کی اب توجیہ ممکن نہیں ہے، پتہ چلا لیتے اور مشرق و مغرب کے طرزوں میں ایسا ربط پیدا کر سکتے جس کے اسباب اس وقت ہمارے علم میں نہیں ہیں۔

صوبہ سندھ کی عمارتیں تقریباً ہر زمانے سے اینٹ کی بنائی جاتی رہیں کیونکہ پتھر کی بہت کمی ہے۔ بنگالے کی طرح یہاں روئیدگی کی تو وہ آفت نہیں ہے جو مکانات کو منہدم کر دیتی تھی لیکن چونا اچھا نہیں دوسرے زمین کا شعورہ ریہ بن کے اینٹ کو خراب کر دیتا ہے۔ ان کی جڑیں آسانی سے ہل جاتی ہیں اور دہقان عوام الناس انہیں بے تکلف نکال کر اپنی جھونپڑیوں میں لگا لیتے ہیں۔

اس وقت تک ہمیں جو کچھ علم ہے وہ بیشتر نواحِ ملتان کے ایک سلسلہ مقابر سے متعلق ہے جو شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں سندھ کے صوبہ داروں یا آمرانے بنوائے تھے۔ کم سے کم آج کل تو سب سے قدیم وہی مقبرہ مانا جاتا ہے جسے جامِ نطم سام الدین نے سندھ میں قریب قریب اسی زمانے میں بنوایا جب کہ دکن گیر کی مسجد تعمیر ہوئی (سلسلہ) اس کے بعد کی عمارتیں تعمیر خالی

کا مقبرہ ہے جو ۱۵۶۲ء کے قریب تعمیر ہوا جب کہ اکبر نے خاندان جام کا خاتمہ کر کے سندھ کا سلطنت منتقلیہ میں اسحاق کر لیا تو اس سے قبل کے شاہی خاندانوں کی مساجد و مقابر کی اب تک پیمائش اور کیفیت بیان نہیں کی گئی بعد کی عمارتوں کا دور ۱۵۶۲ء سے ۱۶۱۹ء تک ہے اور یہ سب اسی زمانے یا کچھ قبل کے ایرانی طرز تعمیر سے نمایاں مناسبت رکھتی ہیں۔ ان کی عام صورت بتانے کے لیے ہر دست ایک ہی نمونہ پیش کرنا کافی ہو گا۔ یہ امیر خاں کے وزیر یا نواب شہر فاخاں



تصویر نمبر ۲۲

کا مقبرہ ہے اور امیر خاں شاہجہاں کے زمانے میں ۱۶۱۲ء سے ۱۶۲۲ء تک اور بعد ۱۶۴۲ء سے ۱۶۵۹ء تک سندھ کا صوبہ دار رہا۔ مقبرے کا سہ نہایت ظاہر ۱۶۴۲ء ہے۔ یہ ۴۰ فٹ ۴ انچ مربع اور چھین روغنی اینٹ کی عمارت ہے۔



بنیاد اور کرسی تعمیر سے بنائی ہے۔ اس قسم کی دوسری عمارتوں اور عموماً ایرانی  
 اقبیہ کی مثل زنجین چوکوں سے اسے آراستہ کیا ہے جو حقیقت میں نہایت  
 خوبصورت اور رنگ کے کمال تناسب کے ساتھ جمائے گئے ہیں۔ عمارت  
 کی زیب و زینت کے واسطے یہ کچھ بہت پائے دار تدبیر نہیں ہے لیکن جہاں کہ  
 سولہویں صدی کے وسط میں بابت المقدس کے قبة الصخرہ میں یا تیرھویں  
 صدی کے آغاز میں تبریز کی مسجد اور عام طور پر ایرانی عمارتوں میں نظر آتا  
 ہے اس طرز تعمیر میں کمال دلنہنی ضرور ہے۔  
 صوبے کے دوسرے مقبروں کی طرح شرفاں کا یہ مقبرہ بھی ہمصر  
 ایرانی عمارات سے ہے اس قدر مشابہ اور سندوستان خاص کی ہمصر عمارات  
 سے اس درجہ متباہن ہے کہ ہم بلاشبہ شک بنانے والوں کی قومیت  
 معلوم کر سکتے ہیں۔

۱۔ قلعہ کی باج مسجد جو ۱۷۷۷ء کے قریب تعمیر ہوئی اور صوبے کی دوسری مساجد و مقابر کے زنجین  
 چوکوں کی کثرت سے مثالیں کوثر کے مضمون Port folio of ..Sind tiles "۱۷۷۷ء  
 میں پچاس تصاویر کے ساتھ پیش کی گئی ہیں مگر جامع مسجد قلعہ یا دوسری عمارتوں کے بن کے چوکوں  
 کی یہ تصویر یہاں نقشے وغیرہ کچھ نہیں دیئے گئے کہ ان کے مقام وغیرہ کا صحیح پتہ معلوم ہو جاتا ہو  
 ۲۔ "ہٹری ادن"۔۔۔ آرکیٹیکچر جلد دوم۔ ۱۷۷۷ء

# باب دہم

## مغلیہ طرز تعمیر

شاہی خاندان - مقبرہ محمد غوث گوالیاری - مسجد چٹوڑی -  
 اکبر کا مقبرہ - دہلی محل - روضہ ممتاز محل - موتی مسجد -  
 دہلی کی مسجد - مارٹی نیری، بیگم کوٹھی اور لکھنؤ کا  
 امام باڑہ - صورت کی انگریزی مقابر - جونا گڑھ کا مقبرہ

## سنین

۶۱۵۵۶

۶۱۶۰۵

۶۱۶۲۸

۶۱۶۵۸

۶۱۶۵۸

۶۱۶۵۸

۶۱۵۲۶

۶۱۵۲۰

۶۱۵۲۹

۶۱۵۴۵

۶۱۵۴۵

۶۱۵۴۵

بابر

ہمایوں

شیر شاہ

اسکیم شاہ

وفات

اکبر

جہانگیر

شاہ جہاں

اورنگ زیب (عالم گیر)

ہمایوں شاہ اول

نصف صدی پہلے تک اس طرز تعمیر کی جسے مغل بادشاہوں نے رواج  
 دیا، کیفیت لکھنا پورے اسلامی طرز تعمیر کی تباہ سمجھا جاتا تھا اسی طرز پر تاس رو

تبرنیر اور بعد کے سب سیاح خامہ فرسائی کرتے رہے۔ ڈومیل کے نقشوں نے اسے اہل یورپ میں روشناس کر دیا اور جب آگرہ اور دہلی عملاً انگریزوں کے قبضے میں آئے تو یہاں کی تصویریں اور نقشے قریب قریب اسی طرح مقبول و مقرون ہو گئے جسے خود یورپ کے کسی شہر کے نقشے۔ احمد آباد، بجا پور وغیرہ دوسرے شہروں کی مقابروں کے مقابلے کی عکسی تصاویر بھی کہیں ایک عرصہ میں جا کے لوگوں کو ان عمارات کی خوبیوں سے آنا دائق بنا سکیں گی۔ حالانکہ یہ دعویٰ کرنا غالباً غلط نہ ہو گا کہ دوسرے بادشاہوں کی عمارتیں (جن کا آغاز قطب اور اجمیر کی مسجدوں سے اور اختتام سلطانین و کن کی عمارات پر ہوتا ہے جب کہ ان کی بادشاہی کا چراغ گل ہوا) مجموعی طور پر اسی قدر بڑی اور وسیع ہیں جس قدر کہ منغل بادشاہوں کی تمام عمارتیں بلکہ تاریخی اعتبار سے مغلیہ عمارات سے بھی زیادہ نجیبی کا سامان رکھتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان مغلیہ امینہ میں ایک ایسا تسلسل اور تاریخی طور پر ڈھکیل کی شان پائی جاتی ہے جس سے ان کا مطالعہ بہت ہی دلکش ہو گیا ہے دوسرے ان میں بعض عمارتیں اس پائے کی ہیں کہ دنیا کے کسی ملک کے کسی تعمیری کارنامے سے بھی ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ بعض اعتبار سے ان میں جو نہرت اور فن کے اعجاز نمایاں ہیں، وہ انھیں سب سے ممتاز اور کچھ ایسا انسانی بنا دیتے ہیں کہ کسی دوسری عمارت کو ان کے مقابلے میں لانا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مثلاً، پارٹھی نون کی عمارت کا روضہ ممتاز محل سے کیا مقابلہ کیا جائے؟ عرض و طول یا شان و شکوہ میں دونوں تقریباً برابر ہیں۔۔۔ دونوں سنگ مرمر سے بنائی گئی اور ان کے اپنے اغراض کے لیے نہایت موزوں معنی ہیں، مگر اس کے علاوہ اور کونسی بات ان میں مشترک ہے؟ ایک تو یہ ہے سادہ خلط کی عمارت ہے جس کی بیرونی زیب و زینت کا انحصار صرف ستونوں پر ہے۔ گرد و سری (یعنی تاج) میں ایک بھی ستون نہیں بلکہ اس کی ساری دلکشی نقشے کے حیرت انگیز سہت و بلند اور مختلف اجزاء کے عجیب طریقے پر ترتیب دینے میں پائی جاتی ہے کہ بعض حصے اصل عمارت سے بالکل جدا ہیں۔ یہ سچ ہے کہ پارٹھی نون سنون لطیفہ

کی زیادہ اعلیٰ قسم کا نمونہ پیش کرتا ہے اور اس کی نسبت گری نے اسے اظہار جذبات کی سب سے کمال صناعت کی جو ذہن انسانی نے ایجاد کی ہے یا دیگر بنا دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف تاج میں جوارات سے جو لاجواب نیکونہ کاری کی گئی ہے وہ صفت کے اعتبار سے اتنی خوبصورت ہے کہ محض عمارت کی حیثیت سے اسے قریب قریب یونانی شاہکار کے مرتبے تک لے آتی ہے۔

اگرچہ اس طرح ان کی معنوی قدر و قیمت قریب قریب مساوی مان لی جائے لیکن صورت میں وہ ایک دوسرے سے اصولاً اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں سنون لطیفہ کی ایک ہی شاخ سے منسوب کرنا مشکل ہے۔ یہی ظاہر ہے کہ فن تعمیر اصولاً اور یقیناً ایک رسمی فن ہے اور اگر اس کی ہر جدید وضع سے پوری واقفیت اور ابتداء اور استعمال سے کمال اٹھی نہ ہو تو کوئی آجہبی آسانی سے ان حقیقی محاسن کا فیض اندر نہ کر سکتا جو کہ اکثر عجیب اور نرالی انصاف کی تہ میں پنہاں ہوتی ہیں۔ لہذا فن کے دو بالکل مختلف نمونوں کے مقابلے میں اور بھی دشواری واقع ہوتی ہے۔ بایں ہمہ ان سب دشواریوں کے عہدہ برآ ہونے کے بعد غالباً یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ مشرقی طرز ہائے عمارت میں سب سے زیادہ توجہ اور فائدہ بخش مطالعے کے قابل اساطیر منعل ہی کا طرز عمارت ہے۔

اس سرگزشت کے ابتدائی مراحل میں شیر شاہ اور اس کے بیٹے سلیم یا اسلام کے عروج میں آگئے۔ اسے قدرے انتشار پیدا ہو گیا کیونکہ ان کے زمانے میں سلطنت سلطنت اپنے اپنے تہذیبی تمدن میں غرق تجارت (جلداول) میں نے وہی عددی سیار اختیار کیا ہے جو مغرب پر سپر اڈوف بیو ان آرٹ کے مقدمے میں درج ہے اور اس کے حساب کے اندازہ لگایا ہے کہ بارہویوں میں نہ نئی کم ذوقی اور نہ غلبہ جذبات کی خواہشیں ہیں اور اس کے محاسن کی مجموعی تعداد ۲۲ ہوتی ہے جو دنیا کی کسی اور عمارت کو حاصل نہیں اس کے مقابلے میں ردیف متاثرہ عمل میں نہ فنی ذوقی اور اظہار جذبات کی خواہشیں ملے کہ انہوں نے انہوں نے اس میں براہ مدت کسی پیکر تراشی سے یہ کام نہیں لیا کیا تاہم اس کے اجزائی عجیب ترتیب میں اس میں دوسو گوری کی پورے در شان موجود ہے جس کے اظہار کی غرض سے یہ عمارت بنائی گئی تھی اس حساب سے ردیف کے محاسن کی عددی نوشتہ

قابض ہو گئے اور سلا افغان اور مولدا بندہ تھے اور اگر اپنے حسب مذاق کام کرنے کا موقع پاتے تو ضرور ہندوستان کے انہی سلاطین کے طرز تعمیر کا متبع کرتے جو مغلوں کے حملے سے پہلے دہلی و آگرہ میں بہت سی عمارتیں بنائے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلق شاہ کے انتقال اور بارگاہی سے پہلے حملے کے درمیان ۷۰ برس کا جو زمانہ گزرا ہے اس کی کوئی ایسی یادگار موجود نہیں ہے کہ ہم ٹھیک ٹھیک اس عہد کے طرز تعمیر سے واقف ہو سکیں لیکن آناضوہر معلوم ہے کہ یہ سادہ اور مستحکم اور اس پر مجمل صناعی سے بالکل مختلف تھا جو سلاطین مغلیہ نے اختیار کی یا جس سے خود شیر شاہ اور اس کے بیٹے نے بظاہر ہندوستان کے نئے (مغل) فرمانرواؤں کی رقابت کے جوش میں کام لیا۔ خلاصہ یہ کہ شیر شاہ کے طرز تعمیر اور اس کے طرز میں اتنا کم فرق رہ گیا ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی سمجھ سکتے ہیں جو کمال تانت و نفاست سے شروع ہوا اور آخر کار اس میں تکلف و تزئین کی بہت ہی افراط ہو گئی اگرچہ اس کا حسن پھر بھی بدرجہ کمال باقی رہا بلکہ بعض اعتبار سے وہ مغلوں کے بعد کے طرز پر بھی (جس میں پاکیزگی کے باوجود شان و شوکت میں کمی لگئی تھی) فائز سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک اور خفیف دشواری اور پریشانی یہ بھی لاحق ہوتی ہے کہ باہر و تہا لچ نے جس طرز سے کام لیا، اس کی مثالیں ہمارے سامنے موجود نہیں رہیں۔ ہاں ہمارے کامشہور مقبرہ یقیناً اس کے بیٹے اکبر نے بنوایا۔ باہر کی تدفین کا بلقے میں ہوئی اور اس کے نام کی کوئی عمارت ہندوستان میں نہیں پائی گئی۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس نے عمارتیں بنوائیں۔ اپنی تزک میں خود سحر کرتا ہے کہ ”اگرہ میں صرف سنگتراش جو میرے محلات میں روزانہ کام کرتے ہیں، ان کی تعداد ۶۸۰ ہے اور سیکری، بیانہ، دھولپور، گوالیار اور کول سمیت ان سنگتراشوں کا

بقیہ ماشیہ منو گزشتہ - ۲۰ ہوگی جو اسکے بیٹے اہتہا لچے اور اسے پانچویں نون کے اس قدر ترب لے آتی ہے کہ کم سے کم دونوں کا سمانہ کیا جاسکتا ہے۔

شمار جو روزانہ مصروف بکار رہتے ہیں ۱۴۹۱ء سے ۱۵۲۶ء تک کے وہ ان میں بعض عمارات، خصوصاً ایک عظیم الشان بادلی کا ذکر کرتا ہے جو قلعہ آگرہ میں کھدوائی تھی۔ یہ ۲۶ سالہ کا ذکر ہے اور آئندہ وہ پانچ سال تک زندہ رہا جو ان کی تعمیر و تکمیل کے لیے بہت کافی زمانہ ہے۔ آئندہ دس سال کے مطلق جس میں ہمایوں حکمرانی کرتا رہا فرشتہ اور دوسرے ماخذوں سے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ نے بھی اپنے دار السلطنت میں بہت سی شاندار عمارتیں بنوائیں مثلاً سات ایوانوں یا کوشکوں کا ایک محل تھا کہ ہر ایوان سب سے زیادہ سے جوہر کے ایک ایک دن پر حکمران ہیں، منسوب تھا ایک مسجد کے بنانے کی بھی روایتیں سنائی جاتی ہیں، جو دریائے جمنا کے کنارے اس جگہ کے بالمقابل واقع تھی جہاں اب روضۂ ممتاز واقع ہے۔ اسی طرح آگرہ اور دہلی کی بہت سی عمارتوں کے سلسلے میں ہم بار بار اس کا نام سنتے ہیں جس سے یقین ہوتا ہے کہ اس کے پریشان عہد حکومت میں جس حد تک مہلت مل سکتی تھی اس حد تک وہ برابر تعمیر میں مصروف رہا لیکن یہ عمارتیں منہدم ہو چکی ہیں اور اب چاروں طرف مغلوں کی عمارات کی تباہی ایک افغان خاندان کے بادشاہوں سے شروع کرنی پڑے گی جو ہمایوں کی زندگی کے آخری سولہ سال میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھ رہا۔

بہت ممکن ہے کہ اگر عہدِ بابر سے سو برس پہلے کی عمارتوں کا مطالعہ کیا جائے جو تیمور نے ہندوستان میں بنوائی تھیں (۱۳۹۳ء تا ۱۴۰۵ء) تو مسلمان مغل کے اس طرز تعمیر کی اصل وابتدا کا بہت کچھ پتہ چل جائے جو انہوں نے ہندوستان میں رائج کیا۔ اور اب کہ یہ شہر و دیہات کے قبضے میں آئے اہل یورپ کی اس تک رسائی بھی آسان ہو گئی ہے لیکن اس کی عمارات کی تصاویر اور نقشے لیے جانے کے باوجود کسی نے ان کی ایسی

کیفیت نہیں لکھی کہ عسلی اغراض کے لئے ان سے کام لیا جاسکے البتہ ان تصویروں سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم ان سے کس قسم کے افادے کی توقع کر سکتے ہیں۔ بہت سی باتوں میں دشمنی ہونے کے باوجود تیمور عالیشان عمارتیں بنانے کا خالص توراتی جذبہ ضرور رکھتا تھا جس شہر نے اس کا مقابلہ کیا وہاں کے باشندوں کا اس نے عموماً قتل عام تو کیا لیکن مہاروں اور کاریگروں کی اس نے ہمیشہ جان بخشی کر دی اور انہیں اپنے صدر مقامات کی تزئین و آرائش کی غرض سے ادھر بھجوا دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سمرقند عالیشان عمارات سے معمور ہو گیا لیکن جو مصالحہ میسر آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارتیں ہندوستان کی موجودہ عمارات کی بجائے زیادہ ایران کے طرز سے ملتی تھیں۔ مثلاً وہاں شگنی وضع کے گنبد ہر جگہ نظر آتے ہیں حالانکہ ہندوستان میں ان دنوں بجز سندھ کے اس وضع کی کوئی مثال نہیں ملتی اور سندھ خود اس معاملہ میں نیم ایرانی صوبہ تھا۔ آرائش کے لئے رنگین چو کے بہت مقبول تھے اور مجموعی طور پر ہندوستان کی بعد کی افغانی عمارات کی ثقاہت کے مقابلے میں یہ طرز بہت ہی پُر تکلف اور شوخ تھا۔

## شیر شاہ

(۱۵۳۹ء تا ۱۵۴۴ء)

کوئی شبہ نہیں کہ یہ بادشاہ شمالی ہندوستان کے سب سے ممتاز حکمرانوں میں ہے اگرچہ اس کا عہد حکومت صرف پانچ سال کی مدت میں محدود رہا۔ اس قلیل زمانے میں بھی اسے طرح طرح کی پریشانیوں سے سابقہ پڑا جو اس کے غاصبانہ قبضے کا لازمی نتیجہ تھیں۔ بایں ہمہ نظم و نسق کے ہر شعبے پر وہ اپنا نقش چھوڑ گیا۔ نظام مالگزاری، فوجی تنظیم، کو توالی غرض تمام اصلاحات جن کی اکثر نے کامیابی سے تکمیل کی حقیقت میں اسی شیر شاہ نے جسے مثل

غاصب کے نام سے یاد کرتے تھے شروع اور کسی حد تک مکمل بھی کر دی تھیں۔ یہیں سے زیادہ فن تعمیر سے نفلت ہے، سو اس شعبے میں بھی انہی نے وہ راستہ دکھایا جس پر محل کرانے کے جانشین اس رتبہ کمال تک پہنچ گئے۔ پڑ عمارت، جہاں تک مجھے واقفیت ہے شیر شاہ کی سب سے کمال عمارت، دہلی کے پرانے قلعے کی مسجد ہے۔ قلعے کی مرمت ہمایوں نے ۱۵۶۵ء میں کی تھی اور تازہ ترین تحقیقات یہ ہے کہ شیر شاہ نے یہ مسجد ۱۵۶۱ء میں تعمیر کی تھی۔ یہ پانچ در کا ایک وسیع، والاں ہے جس کی گہرائی اس شکل کی ہیں جنہیں ہم ”یوڈور“ وضع“ سے منسوب کرتے ہیں لیکن ان کے نقشے میں غضب کا خوشنما تنوع اور چوکھٹوں کے اندر جن کو رنگین سنگ مرمر سے آراستہ کیا ہے بے مثل گلکاری کی ہے۔ اس کا طول ۱۶۸ عرض ۴۴ اور بلندی ۴۴ فٹ ہے۔ چیمبوں کے نیچے کے قوڑے اس نمونے کے پیشرو ہیں جو قلعہ اگرہ کے بھر بھرے پتھر کی صراحیوں میں خاص طور پر ممتاز ہوا اور گنبد کے نیچے اندرون مسجد کے اویزے بھی بہت نمایاں بنائے ہیں۔ ایک ہی گنبد وسط میں بٹا ہے جس میں ۱۲ روشندان کھول دیئے ہیں۔ چار دیواری یا مینار کوئی نہیں مگر ان لوازم کے نہ ہونے کے باوجود ہندوستان کی یہ سب سے پسندیدہ مساجد میں داخل ہے۔

قلعہ اگرہ کو جب میں نے دیکھا تو اس کے اندر محل کا ایک حصہ شیر شاہ یا اس کے بیٹے سلیم شاہ کا بنایا ہوا نظر آیا جو آرائشی صنعت کی ایسی ہی کمال یادگار تھا جیسی کہ ہندوستان کی اس صنف کی عمارت میں اور کہیں مل سکتی ہے چونکہ اس مقام پر یہ سب سے پہلا محل بنا لہذا اس کی جگہ سب سے بلندی پر تھی اور ہماری انگریزی حکومت نے اسے دیکھ کر بارکوں کے لئے سب سے موزوں خیال کیا اور اسے تڑوا کر اپنی خشتی عمارت جوادی جو معمولاً تو بدھوت ہوتی ہی ہے لیکن یہاں اور بھی زیادہ بھیانک بنی۔ کچھ عرصے بعد اس کے لئے گنڈک ہیم۔ رپورٹس۔ اول ۲۲۲ وغیرہ نوشتہ۔ دہلی“ صفحہ ۲۲۸ جس سے میں نے تصویر لی ہے پڑ



مال خانے کا کام لینے لگے اور اب بھی یہ آہک زدہ، زشتی معمہ مکانِ سلطانین  
مغل کے مرمرین محلات کے اوپر استادہ ہے اور ہر دو قوموں کے ذوق  
میں جو فرق ہے اس کی نہایت عمدہ شہادت پیش کرتا ہے۔  
بہر حال محل کا جو ٹکڑا سلامت ہے اسے دیکھ کر اور مقامی روایات  
سُن کر اندازہ ہوتا ہے کہ ترک و افغان سلاطین کی جو ستائش بابر کی نئی  
سے کہ وہ اپنی عمارتیں ”عفرتیوں کی طرح اٹھاتے اور جوہریوں کی طرح اتمام  
کو پہنچاتے تھے“ وہ کس حد تک بجا ہے کیونکہ چنائی میں جو پتھر لگا کے ہیں وہ  
بہت ہی بڑے بڑے ہیں اور عمارت پر جو کاریگری کی ہے اس میں نازکی  
اور باریکی کا کمال دکھادیا ہے مگر اس قسم کی صد ہا حسین و جمیل عمارتوں  
کی طرح یہ بھی ہماری (انگریزی حکومت) اکی بے پناہ بربریت کی سیل فٹا  
میں بگیا۔ مساجد کو عموماً اور بعض اوقات مقابر کو بھی ہم نے سلامت  
رہنے دیا کیونکہ وہ ہماری معاشی ضروریات کے مناسب نہ تھے اور دیسوں  
کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا بھی قرین مصلحت نہ ہوتا لیکن جب حکمرانوں کو  
ہم نے معزول کیا اور ان کے ملک و مال پر قبضہ جمایا تو ان کے شاندار محلات  
و مقصورے کا رپڑے رہ گئے جن کی وراثت کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہ تھا۔  
پس انہیں قائم رہنے دینے کی بجائے کفایت اور فائدہ اسی میں نظر آیا کہ  
یا انھیں منہدم کر دیا جائے اور یا ان سے سکونت گاہ اور باروت خانوں وغیرہ  
کا کام لیا جائے نتیجہ یہ ہے کہ آئندہ نسلوں کے دیکھ کر خوش ہونے کے لئے  
بہت کم چیزیں ان میں سے سلامت رہ گئی ہیں۔  
شیر شاہ کے مقبرے کا ہم اوراقِ ماضی میں تذکرہ کر چکے ہیں کیونکہ

اے کہن کی آگرے پر کتاب میں جہاں قلعے کی کیفیت بیان کی ہے وہاں اس عمارت کا کوئی سراغ مجھے نہیں ملا  
لہذا یہ فرض کیئے بغیر چارہ نہیں کہ میرے دیکھنے کے بعد اس (محل) کو بھی کسی کام میں لے آیا گیا ہو گا بخیر  
اس کے کہ ہم اسے وہ عمارت تصور کریں جسے یہ مصنف اکبر کا ذب خانہ موسوم کرتا ہے مگر اس مقام کی  
عکسی تصاویر میں کہیں میں نے یہ عمارت نہیں دیکھی۔

وہ اصولاً پٹھان طرز کی عمارت ہے۔ یہ اس کے وطن (ملک بہار) میں گنگا کے جانب جنوب اور اس عہد کے مغلیہ اثرات سے بہت فاصلے پر بنائی گئی۔ اس کے طرز تعمیر میں وہی خشک سادگی نمایاں ہے جو تعلق اور صحیح معنی میں آخری آزاد افغان بادشاہ - بہلول لودھی (۱۶۸۹ء تا ۱۷۰۵ء) کے درمیان کے زمانے میں نسل افغانہ کی تعمیر ہی خصوصیت تھی۔ یہ صاف طور پر معلوم نہیں کہ اس مقبرے کا کتنا حصہ خود اس نے بنایا اور کتنا اس کے بیٹے سلیم شاہ نے، جس نے بے شبہ اس کی تکمیل کی۔ اسی بادشاہ نے جہان کے ایک کلا پو پر تسلیم گراہ بنایا جسے شاہجہاں نے اپنی نئی دہلی کے قصر سے ایک مل کے ذریعے ملا لیا تھا مگر یہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ اس قلعے کے اندر بھی کوئی عمارت اس نے بنوائی تھی۔ کم سے کم آج کل تو کوئی قابل ذکر عمارت موجود نہیں ہے۔ بظاہر وہ زیادہ تر اپنے باب کی اہمیت ہی کی تعمیر تکمیل کرتا رہا۔ بہر حال ان باب مبطلوں نے مل کر جو آثار اپنی یادگار چھوڑے ہیں، ان سب کو اکٹھا کیا جائے اور ان کی باتصویر کیفیت بیان کی جائے تو مذہبی مسلمانوں کے طرز ہائے عمارت کی تیاری میں یہ مجموعہ ایک کوکب باب کا اضافہ کر دے گا۔

## کبیر

۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء

اس نامور شخص نے اپنے ۴۹ سال کے طویل عہد حکومت میں جو عمارتیں

لے صراحت کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ قلعہ بہناس کی شان و شوکت کس قدر اکیبر کی رہنمائی سے، اور کتنی شیر شاہ کی۔ تحقیق ہے کہ دونوں نے وہاں تعمیر کی اور اس مقام پر پیکر آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کتنا کتنا حصہ ہے۔ کمال انیس کی بات ہے کہ اچھڑیوں نے اس خوبصورت دیوان خانے کو جس کا وہ قیل نے نقشہ بنایا تھا، ٹھوڑوں کے بچے لینے کے واسطے اب ساڈھا نہ بنا رکھا ہے۔

پبلشمن: بگڑے ٹیر، عنوان: بہناس گڑھ

بنائیں، ان کا حال لکھنے کے لئے ایک پوری جلد درکار ہے اور تصویریں بھی ان کی جلد خصوصیات دکھانے کے لئے مشکل سے کافی ہونگی۔ اگر آکبر اس طرز کے نتیجے پر قناعت کر لیتا جو ترک و افغان سلاطین ہند نے اختراع کیا اور شیر شاہ کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی، تو اس کے نتائج کا سراغ آسانی سے لگایا جاسکتا تھا لیکن اکبر کے مزاج کی بڑی خصوصیت وہ مذہبی رواداری تھی جو اس کے جملہ افعال سے ثابت ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں اپنی ہندو رعایا کی ایسی ہی سچی محبت و قدر تھی، جیسی اپنے ہم مذہبوں کی۔ اور خواہ طبعی میلان سے خواہ منسلحت کی بناء پر، وہ ہندو فنون کی بھی ایسی ہی سرپرستی کرتا تھا جیسی خالص اسلامی فنون کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام آثار میں دو طرزوں کی آمیزش موجود ہے۔ یہ آمیزش اگر خوشنماگر خلاف ٹھول پائی جاتی ہے۔ البتہ امید تھی کہ اگر آدھی صدی اور یہی سلسلہ جاری رہتا تو یہ دور بھی تکمیل مل کے ایک جدید متقل طرز کی صورت اختیار کر لیتی۔ لیکن رواداری کا جذبہ اسی کے ساتھ دفن ہو گیا۔ جہانگیر و شاہجہاں کی عمارتوں میں ہندوین کا مطلق اثر نہیں پایا جاتا اور اورنگ زیب تو محض یہ خیال سنسکر خوفزدہ ہو جاتا کہ اس کے کسی کام میں کفار کے فنون کا دخل بائز رکھا جائے۔

غالباً اکبر کے سب سے ابتدائی کارناموں میں وہ مقبرہ ہے جو اس نے اپنے باپ ہمایوں کی قبر پر تعمیر کرایا۔ ہر چند اس کی تکمیل یقیناً اکبر نے کی لیکن اس کی بنا ہمایوں کی بیوہ ملکہ مریم مکانی (جانبی بیگم) نے رکھی تھی اور ششما میں پندرہ لاکھ روپے کے خرچ سے یہ عمارت اتمام کو پہنچی۔ یہ قیاس کہ شروع ہی میں اکبر نے اسے بنایا ہو گا اس واسطے بھی قرین صواب ہے کہ جیسا کہ اس کتاب کے گزشتہ اوراق میں بار بار بتایا جا چکا ہے، تاتاری یا مغلیہ اقوام کی ایک بڑی تعمیری خصوصیت مقبرہ سازی کا میلان ہے جو متحدہ دنیا کی باقی دو بڑی نسلوں یعنی آریہ اور سامی نسل کے لوگوں سے نمایاں طور پر تاتاریوں کو متمیز کرتی ہے۔ اس خصوصیت کا اظہار اس قوت کے ساتھ

اور کہیں نہیں جوتا جس قدر کہ ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی آمد کے  
ابتدائی تسنین سے لے کے آج تک ترک و افغانہ اور مغلوں کے مقبرے  
آثار قدیمہ کا ایک غیر منقطع اور مکمل سلسلہ عمارات پیش کرتے ہیں پڑ  
پڑھاؤں کے مقبرے اتنے شاندار نہیں۔ برائے تہم پورا اسلحہ سے  
زیادہ دلچسپ ہے اور ان کی تعداد بھی مسجدوں سے زیادہ ہے۔ ساخت کے  
اعتبار سے وہ عموماً صناعی کا بہتر نمونہ ہیں اور بیشتر صورتوں میں نہ صرف زیادہ  
بڑے بلکہ جملہ دار استلکی میں بھی ان عمارتوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں جو صرف  
عبادت کے واسطے بنائی گئی تھیں پڑ

تاتاری نسل کے بادشاہوں نے شوق مقبرہ سازی کے باعث یہ بھی  
معمول کر لیا تھا کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے مقبرے تعمیر کریں اور جو لوگ بعد مرگ  
شہرت و شان دکھانے کے خواہش مند ہوں انھیں لامحالہ یہی کرنا پڑتا ہے۔  
مگر مغلوں نے یہ عمارتیں بنوانے میں مصری طرز کے کی تقلید نہیں کی کہ بڑے  
بڑے اہرام یا پہاڑ کی چٹانوں کے اندر تاریک و خست حجرے بنواتے۔ اس  
برخلاف انہوں نے اپنے مدفن اس شان کے بنوائے کہ زندگی میں تو وہ  
اور ان کے دوست و ہاں سیر و تفریح میں وقت گزار سکیں اور صرف اہمیت  
جب کہ عیش و تفریح کا امکان نہ رہے، وہ مقام ان کے فانی اجسام کا  
پر عبرت مسکن بن جائے پڑ

ان عمارتوں کے تیار کرنے کی عام صورت یہ ہے کہ بادشاہ یا امیر جوانے واسطے مقبرہ بنانا چاہتا  
وہ شہر شاہ کے باہر عام طور پر چار دیواری گھنچ کر جس میں ایک یا دو شاندار دروازے  
ہوتے ایک باغ نصب کراتا اور اس کے وسط میں مربع یا مستطیل قبة دار عمارت ہوتی زیادہ  
شان شوکت کی عمارت ہوئی تو چاروں گوشوں یا پہلوؤں میں بھی برجیاں  
اور لداؤدے کے کمرے بنادیے جاتے اور باقی چار جانب آمد رفت کے  
واسطے کھلے رستے دیتے تھے۔ یہ عمارت عام طور سے اونچے اونچے چوڑوں  
پر بنائی جاتی اور ہر ضلع کے وسط سے چوڑی چوڑی روشتیں نکالی جاتیں۔  
جن کے درمیان عموماً سنگ مرمر کی نہریں بنادیتے اور انکی زیب زینت

نواروں سے بڑھادی جاتی۔ ایک جانب مسجد کا ہونا بھی مقبرے کا لازمی جزو تھا۔ خالی گوشوں میں سرد و بادوسرے سدا بہار اور سیوہ وار درخت نصب کر کے اسی مروجہ نمونے کا ایک خوشنما باغ تیار کر دیتے جیسے کہ مالک مشرق کی ایک خصوصیت ہے۔ بانی کی زندگی میں وسطی عمارت بارہ درمی کہلاتی اور اس کے اور اجاب کے لئے گرمی گزارنے یا تفریح و تفسن کا مقام ہوتی اور جب اس کا انتقال ہوتا تو اس کی نوعیت بدل جاتی کہ بانی کا جنازہ بڑے گنبد کے نیچے دفن کر دیتے بعض اوقات اس کی محبوب بیوی کی قبر پہلو میں ہوتی لیکن عام طور پر بیوی بچوں کو پہلو کے گنبدوں میں دفن کر دیتے تھے۔ دفن بن جانے کے بعد پھر عیش و تفریح کا اس عمارت سے کام نہ لیا جاتا تھا۔ اس کی نگرانی کسی ملایا فقیر کے حوالے کر دی جاتی جو باغ کے شہرے اور مرحوم کے عزیز و اقربا سے جو فاتحہ پڑھنے آتے، خیر خیرات پر اپنی گذراؤات کرتے تھے۔ جیل اور قہقہوں کی بجائے مقبروں میں کامل خاموشی اور سناٹے کا عالم ہو جاتا اور گرد و پیش کی اشیاء کا دلکش منظر سکوت و سکون کے ساتھ مل کر عجیب کیفیت پیدا کر دیتا جو اس مقام کے لئے جتنی مناسب اور پُر اثر ہے اسی قدر لطیف و خوش آئند بھی ہے۔

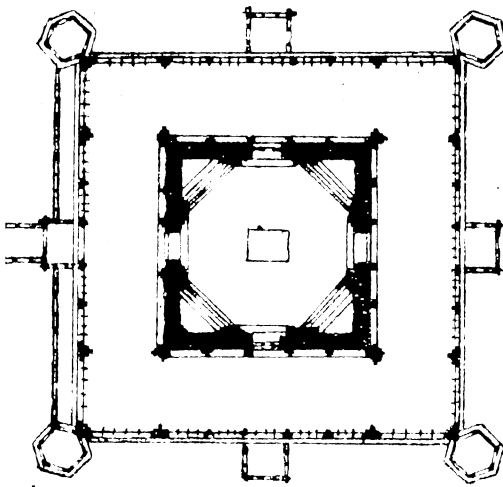
یوں تو اقطار ہندوستان میں ایسے مقبرے بے شمار اور اکثر کی چار دیواری کے آثار بھی موجود ہیں لیکن غالباً ایسا مقبرہ صرف ایک رومندہ متنازع محل ہے جس کے باغ کا حسن کسی حد تک اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں محفوظ رہ گیا ہے اور یہی سبب ہے کہ اس شہرہ آفاق مقبرے کی چار دیواری میں جمال فطرت اور حسن صنعت نے کمال خوبی سے مل کر فن لطیف کا وہ کامل نمونہ ہم پہنچایا ہے جس کی نظیر شاید ساری دنیا میں کہیں نہ ملے گی۔

ہمایوں پہلا مغل بادشاہ ہے جو ہندوستان میں دفن ہوا۔ پرانی دہلی کے کھنڈروں میں اس کا مقبرہ بھی تک خاصی طرح صحیح سالم حالت میں ہے

بلکہ ان آثار قدیمہ میں سب سے زیادہ قابل دید اور بڑی عمارت یہی ہے۔ یہ نہایت وسیع ۲۲ فٹ بلند اور مربع حیوترے پر بنی ہے جس کی خوشنما محابوں کے پائے سنگ مرمر کی کچی کاری سے اور بھی خوبصورت ہو گئے ہیں۔ خود مقبرہ نیچے سے مٹن الوائن ہے جس کا عمود ۴۴ فٹ ۴ اور اوپر سنگ مرمر کا گنبد بہت ہی دلکش ڈھلاؤ دے کے بنایا ہے۔ مٹن کے چار ضلعوں پر دروازے اور باقی چار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مٹن کمرے ۲۳ فٹ عرض بنادیئے ہیں۔ یہ ہر رخ کی وسطی محراب کے آگے کو بڑھے ہوئے ہیں اور ان کو جاہ بانگ مرمر لگا کے خوب ممتاز کر دیا گیا ہے۔ ان گوشوں کے حجروں میں بلکہ مریم مکانی (حاجی سنگم) اور شاہی خاندان کے کوئی نو اور افراد کی قبریں ہیں، یہ سب گوشے اور ترا داسطی کمرہ مل کر پوری عمارت قریب قریب مربع بن گئی ہے جس کا ہر ضلع ۵۵ فٹ اور زادینے قدرے کٹے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں اہی مقبرے کے نقشے پر بعد میں روضہ ممتاز محل تیار ہوا لیکن اس کی گہ زیادہ رہی تھی۔ دوسرے اس میں جو عجیب متناسب پیدا ہو گیا ہے اس مقبرے میں کہاں، بلکہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہی نقشے کی حد سے زیادہ سادگی ہے اسی لئے اکبر نے جو دوسری عمارتیں بنوائیں یہ ان سب سے اس قدر کم ملتا ہے کہ سمجھیں نہیں آتا کہ اس کا نقشہ بھی اکبر نے بنوایا ہو گا۔ قدیم ترک و افغان سلاطین کے مقبروں کی خوشنما رفت اور اولوالعزمی بھی اس میں نہیں اور حقیقت میں اپنے زمانہ بنا سے ایک صدی بعد کی عمارت معلوم ہوتا ہے ان سب باتوں کے باوجود یہ نہایت شاندار مقبرہ ہے اور کسی دوسرے ملک میں ہوتا تو ضرور وہاں کے عجائبات میں شمار ہوتا کہ لیکن اس عہد کے طرز تعمیر بنانے کی غرض سے بہتر ہو گا کہ ہم

۱۔ گنبد کے گرد اوپر کی سنہل میں جو حجرے اور برجیاں ڈھولنے کی منبوطی کے واسطے بنائی ہیں۔  
ان میں کسی وقت ایک مشہور مدرسہ تھا جو مدت سے اُجڑ چکا ہے۔

محمد غوث گوالیاری کے مقبرے کی کیفیت لکھیں جو عہد اکبری کی ابتدا میں تعمیر ہوا اور اسی زمانے کے مقابر کا بدرجہ غایت و حجب نمونہ ہے۔  
اس مربع عمارت کا ضلع سو فیٹ نقشہ مقبرہ شاہ محمد غوث گوالیاری



تصویر ۲۲

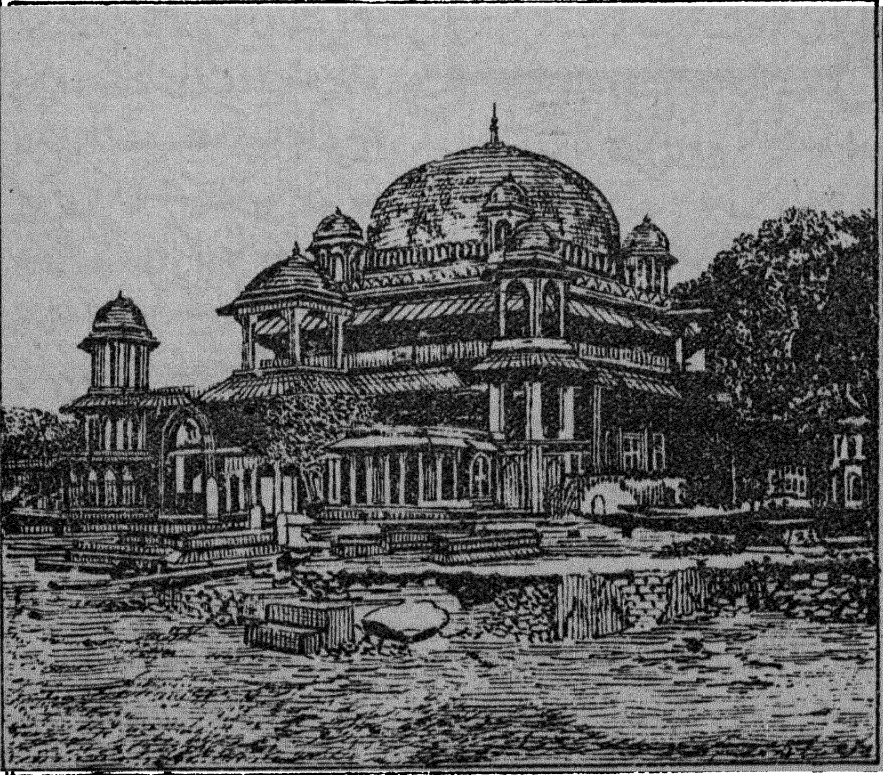
نپتا ہے بشرطیکہ گوشوں کے مسدس  
برجوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اصل قبر  
کا حجم ۴۲ فیٹ مربع ہے جس کے  
زاویے کاٹ کر دہاں نوکدار  
موجز اس طرح قائم کی ہیں کہ  
یہ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔ ان چاروں  
طرفوں پر گنبد تیار کیا ہے اور چاروں  
طرفوں پر گنبد گردش بنائی ہے جو  
پالیوں کے درمیان ۲۰ فیٹ چوڑی  
اور ہر طرف سے ایک جالی سے  
گھری ہوئی ہے جس میں تعمیر تراش کر  
بے مثل نقش و نگار بنائے ہیں اور  
ہر روکار پر آگے کو نکلا ہوا کمانچہ دار دروازہ رکھا ہے۔

یہ عمارت شیر شاہ کے مقبرہ سے مسلم سے کئی اعتبار سے مشابہت رکھتی  
ہے لیکن ان دونوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قلیل مدت ہی  
کے فرق میں جو ان دونوں کی تعمیر کے درمیان گزرا، مقبرہ سازی میں کافی تبدیلی  
ہوئی۔ مربع کے مقابلے میں چاروں طرف کی عمارت میں ایک طبعی کمزوری ایسی  
کہ افغانہ بھی پوری طرح اس کی تلافی نہیں کر سکے دوسرے باہر کے رخ جالی کا

شاہ محمد غوث اسلم گوالیاری قدس سرہ کا انتقال ۱۵۶۲ء میں ہوا (آئین اکبری، ترجمہ  
بلوچ من، جلد اول، ۴۵)

۱۵۷۱ء میں بلوچ من کا نقشہ خیر کننگ ہم کی رپورٹس (دوم، لوح ۹) سے لیا گیا ہے گراس نے مربع  
دروازوں کو چھوڑ دیا تھا جسے تصاویر کی بناء پر میں نے بڑھایا ہے

جو کام کیا گیا ہے وہ سہسرام والے مقبرے کے کھلے ہوئے والا نول کی نسبت کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ اس فرق کا کسی حد تک یہ سبب بھی ہو گا کہ گوالیار ایسا شہر تھا جہاں آرائشی قسم کے عمارتی کام ایک مدت سے ہوتے چلے آتے تھے اس لئے عجب نہیں کہ وہاں بہت اعلیٰ درجے کے معماروں اور کاریگروں کا گروہ ہمیشہ سے موجود ہو۔ بجا لیکہ سہسرام ایک دور دست قریہ تھا جہاں یہ فوائد میسر نہ تھے۔ بہر حال جو کچھ بھی سبب سمجھئے اس میں شک نہیں کہ اتنی سی مدت میں ایسی ترقی کا ہو جانا اسی اکبری ذہانت کے طاقت افزا آثار میں داخل تھا جو آگے چل کے بڑے بڑے عجاز و گھمانے والی تھی۔





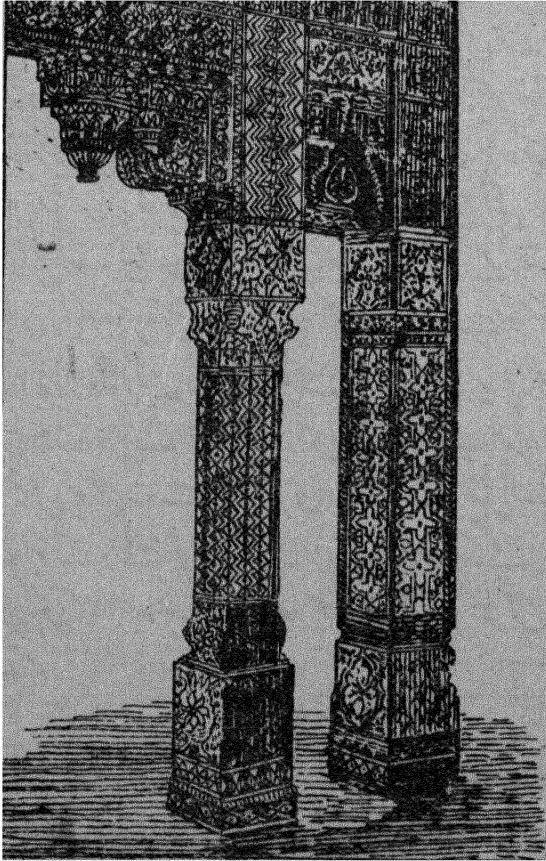
عہد اکبری کی ایک بہت ہی ممتاز اور خاص یادگار قلعہ آگرہ کا چرانا  
یا لال محل ہے جس کا یہ نام اس لئے مشہور ہوا کہ وہ سنگ سرخ یا  
بھڑ بھڑے پتھر سے بنایا گیا ہے جو انیسویں صدی کے اٹلیا ہے۔ اگرچہ قرینہ غالب یہی  
ہے کہ اسے اکبر نے بنوایا تھا، لیکن عرف عام میں اسے جہانگیر محل بھی کہتے ہیں  
اور یہ انگریزی باغ اور خاص محل کے جنوب کی طرف واقع ہے۔ یہ خاص محل  
وہ عمارت ہے جس کا بیشتر حصہ غالباً شاہجہاں کا کارنامہ تھا، نہ انقضاء یہ  
لال محل ایک چوکور عمارت ہے جس کا عرض ۲۴۹ اور طول ۲۶۰ فٹ  
اور چیمبر میں اندر کا صحن ۷۱ x ۲۷ فٹ ہے صحن کے دونوں طرف  
ایک دوسرے کے مقابل دو دروازاں بنے ہوئے ہیں جن میں سب سے  
بڑا ۶۲ x ۳۷ فٹ کا ہے۔ اس کی تھمت چٹائی اور سٹیلوں سے پائٹی  
ہے جس کے دلوں کے نیچے خوشہ تیریاں لٹائی ہیں وہ بالکل مسند دانی  
وضع کی اور بہت کچھ دسٹی ہیں جیسی گوالیار کے دربار شاہی یا مان سنگھ  
کے محلوں میں استعمال کی گئی ہیں حقیقت میں صحن کے گرد ساری عمارت  
کا طرز مسند دانی سے کہیں محرابوں سے کام نہیں لیا بلکہ عمودی ساخت  
اختیار کی گئی ہے چٹائی سطح پر ہر جگہ سنگ تراشی کی ہے اور یہ طرز آرائش  
خاص اکبری ہے جو دوسروں کی عمارتوں میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ سارے  
محل میں محرابوں اور کمانوں سے اس قدر کم کام لیا ہے اور مسند دانی  
اور مسند دانی طرز تعمیر استندار نمایاں ہے کہ یہ محل گوالیار یا جتوڑ میں  
ذرا بھی بے جوڑ نہ معلوم ہوتا اگرچہ عمارت میں جدت اور قوت کا وہ نقش  
برابر موجود ہے جو اکبر اور صرف اکبر اپنی ہر یادگار پر نقش کر دینا جانتا تھا  
لیکن بنا کی حیثیت سے اکبر کا رتبہ جانچنا ہو تو اگر سے سے ۱۲۲  
جنوب مغرب میں فتح پور سیکری جانا چاہئے جو آخر تک اس کے عہد

لے اس محل کا ایک خاکہ نکل گنگہم کی رپورٹس بلکہ چھان لوں سے میں موجود ہے جو

بادشاہی کا سب سے مطبوع مقام سکونت رہا۔ بظاہر اس جگہ کو سب سے پہلے اسی نے آباد کیا اور یہاں عمارت بنانے والا آخری بادشاہ بھی وہی تھا کہ جہاں تک معلوم ہے اس کے اخلاف کی بنائی ہوئی کوئی عمارت وہاں نہیں پائی گئی۔ مگر معلوم ہوتا ہے یہاں اپنا سلسلہ تعمیر شروع کرتے وقت کوئی خاص نقشہ یا منصوبہ اکبر کے پیش نظر نہ تھا۔ ظاہر ابتدائی عمارت محل خاص کی تھی جو سلسلہ ۲۶۰ x ۲۹۰ فٹ تک چلا گیا ہے اور اس حساب سے اگرے کے لال محل سے زیادہ وسیع ہے۔ مگر اس میں دو بڑے بڑے صحن ہیں اور اس کے گرد کے مکانات بھی اراستگی اور تنوع کے اعتبار سے ادنیٰ درجے کے ہیں لیکن ان کی کافی سے زیادہ تلافی ان کوشکوں اور چار دیواریوں سے ہو گئی ہے جن کا وہ وقت کا فوٹہ اضافہ کرتا رہا۔ انہی میں ایک تو وہ چوکور عمارت ہے جسے دیوان خاص کہتے ہیں اور جس میں بہت بڑی گلدستہ نما دیوار گیرمی دیے کے ایک بلند تخت بنایا ہے اور اس کے نیچے کے ستون پر کمال تکلف سے نقاشی کی ہے۔ ایک اور مکان جو دفتر خانہ کہلاتا ہے رواق نما بہت سمجھ اسی طرز پر بنایا ہے جیسا کہ آباد میں ہے اور اس کا ذکر آگے آئے گا۔ ایک پانچ منزل کی عویلی ہے جس کے تمام ستون نقش و نگار سے ملبوس ہیں اور جس کے لمبے والان اور دیواریں ایک کو دوسرے سے ملاتی ہیں۔ پھر ان سب سے بڑھکر خوبصورت اور اس کے خاص طرز کی سب سے ممتاز یادگار تین چھوٹی چھوٹی عویلیاں ہیں جو کہا جاتا ہے کہ اس کی تین محبوب بیگموں کی خوشی اور بخت کے لئے تعمیر کی گئی تھیں اور اسی لئے ایک سیریل کی بیٹی کا محل کہلاتی ہے جس میں جہانگیر کی ماں ملکہ مریم زبانی کا مکان بھی (جس پر تمام سونے کا بانی بھرا ہوا تھا اور وہ اسی لئے نہایت محل موصوم تھا) شامل کر لیا گیا۔ ایک عویلی اکبر کی پہلی بیوی اور چچا منہال مرزا کی بیٹی سلطانہ رقیہ سلیم کا مکان تھا جسے رومی یا ترکی سلطانہ کا محل کہتے ہیں۔ اور مقامی رہبر غلطی سے اسے جو دھ بانی

۱۔ اس تخت کا مولا ہوا منورہ سادہ کن سنگ کن سوریم میں موجود ہے ۲۔  
۳۔ سیریل بادشاہ کے دربار کا بھٹا اور طرفینہ صاحب تھا اس کی بیٹی کا کوئی ذکر تاریخ میں نہیں ملتا اور عام طور پر یہ مکان بھی صرف سیریل کا محل کہلاتا ہے ۴۔  
۵۔ جو دھ بانی جو دھو کے راہہ اور اسے سنہا کی بیٹی اور جہانگیر کی بیوی تھی ۶۔

کا محل بتاتے ہیں یہ تینوں چھوٹی چھوٹی حویلیاں ہیں لیکن نقشے کے اعتبار سے اتنی عجیب و نگارین چیز کا تصور بھی محال ہے اور پھر راتنا اور کام اور نقش و نگار اس کثرت سے کہیں دوسری عمارت میں نہیں مل سکتے طرفہ تریہ کہ کسی جگہ یہ کثرت نہ حد سے بڑھنے والی ہے نہ اس کی نفاست اور جن مذاق پر حرف گیری ہو سکتی ہے جس حویلی کا ہم نے آخر میں ذکر کیا، ذیل میں اس کے دوستوں کے ڈھلے ہوئے نمونے کی تصویر ہے۔ یہ قالبی نمونے کنگٹ ٹن وغیرہ مقامات کے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ خود یہ حویلی، تینوں حویلیوں میں غالباً سب سے



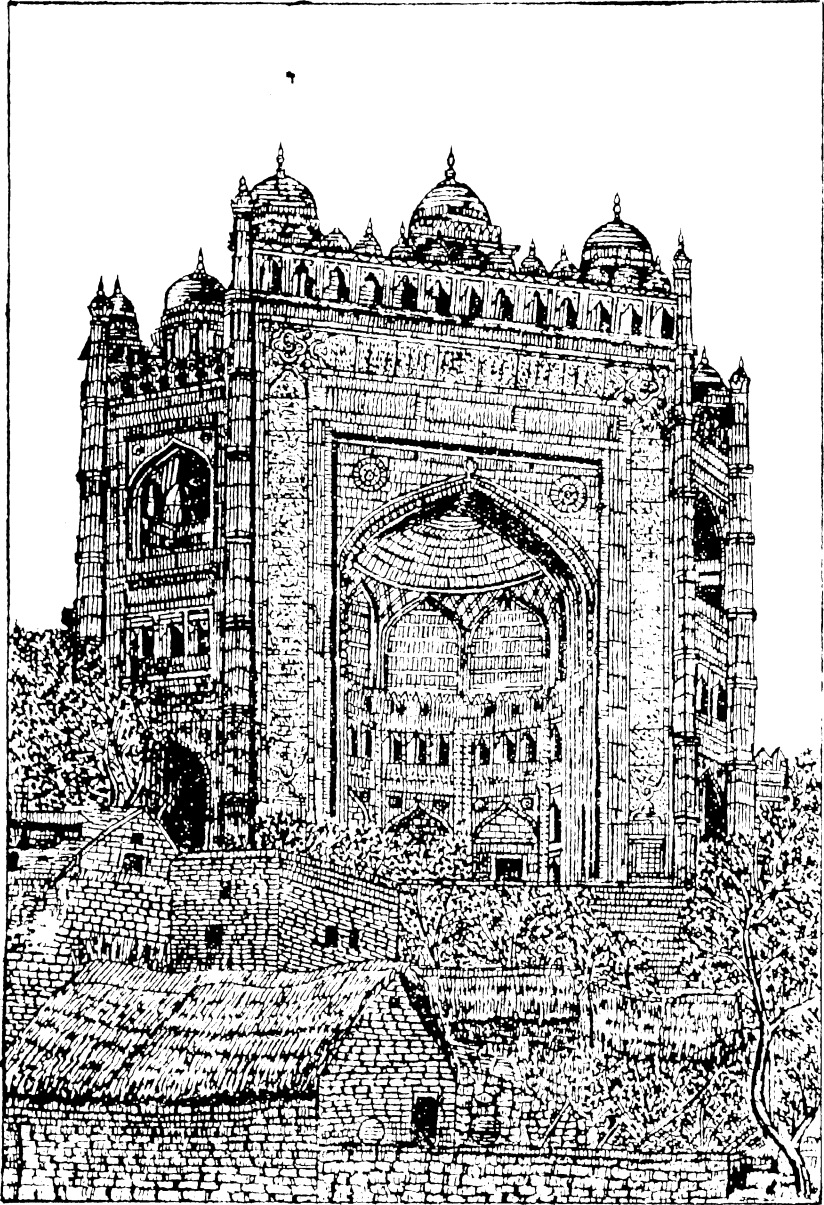
نصوریہ ۲۲۳

زیادہ منقش و مزین ہے مگر اجمالی طور پر ان دو کوسن ذوق کا بہتر نمونہ

قرار دینا چاہئے۔ لیکن فتحپوری سیکرمری کی اصل شان و عظمت اس کی مسجد سے ہے اور مندوستان میں کوئی دوسری مسجد مشکل سے اس پر فوقیت رکھتی ہے۔ یہ آثارِ نسبت شرقاً و غرباً ۴۴ فٹ اور شمالاً جنوباً ۴۴ فٹ ہے لیکن اصل مسجد کی عمارت کا طول ۲۸۸ اور عرض ۶۶ فٹ ہے اور اس پر زمین گنبد بنے ہوئے ہیں۔ صحن کا رقبہ ۲۵۹ فٹ ۲۸۸ فٹ ۹ ہے اور اس کے اندر دو مقبرے ہیں۔ ایک شیخ سلیم حسی رح کا جو تھل و کمال سنگ مرمر کی عمارت ہے اور جس کے روشنان اور جالی میں بے مثل اشکال ہندسی تراشی ہیں۔ واضح رہے کہ پتھر پر دارپار کائے بغیر اس قسم کی نقاشی بعد کی ایجاد ہے۔ مقبرے میں سنگ مرمر کا ایک صحن بھی ہے جس کے نیچے نہایت پر تکلف ساخت کی دیوار گیریاں لگائی ہیں۔ بلکہ تکلف حد سے بڑھ گیا ہے اور ساری عمارت میں یہی چیز ہے جو بذاتی کے قریب تک پہنچ گئی ہے تو دوسرا مقبرہ اسلام خاں کا ہے جو ثقاہت اور حسن ذوق کے اعتبار سے پہلے سے بڑھ چڑھ کر ہے لیکن گرد و پیش سے بالکل دب گیا ہے بلکہ گرجہ کا جنوبی یا بلند دروازہ ان عمارتوں پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ یہ پوری عمارت ۱۲۰ فٹ طویل اور ۸۸ فٹ عرض اور اسی کے مناسب بلند ہے۔ اس کی سطح میں تکمیل ہوئی۔ اسے اونچی کرسی دے کے بنایا ہے اور نیچے سے کھڑے ہو کے دیکھئے تو ایسا عالی شان اور خوبصورت دروازہ مندوستان کی کسی مسجد بلکہ شاید دنیا بھر میں کہیں نظر نہیں آتا۔ دوسرے ہر زمانے کے

نقشہ برصغیر دیگر

۱۔ شیخ اسلام خاں شیخ سلیم حسی رح کے پوتے اور ابو الفضل کے بہنوئی تھے۔ ۱۶۰۰ء میں بنگالے کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور ۱۶۰۵ء میں انتقال کیا۔ ۲۔ آثارِ مشرقی سمت کی ڈیولر اعلیٰ بادشاہی دروازہ کہلاتی ہے۔ ہر چند یہ مسجد کے بالمقابل ہے لیکن بلند دروازے کی نسبت بہت چھوٹی ہے۔



مہار جس مسئلے کے حل کرنے پر اپنی ذہانت صرف کرتے رہے، اور اس میں زیادہ تر کامیابی پائی تو اسلامی معماروں نے پائی، اس عقدے کے حل کر لینے کی سب سے بہتر مثال میں اس دروازے کو پیش کیا جاسکتا ہے جو واضح رہے کہ کسی بڑی عمارت میں اسی کے مناسب عرض و ارتفاع کا دروازہ تیار کرنا ہمیشہ سے ایک وقت طلب معاملہ رہا ہے۔ آدمی کا قد ۶ فیٹ سے زیادہ نہیں ہوتا لہذا ایسے دروازے جو باہتیلوں کے لئے موزوں ہوں، اسے مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ بایں سہمہ یونانیوں کو کبھی بہت نہ ہوئی کہ اپنے بڑے بڑے دروازوں کے پیمانے میں کمی کریں۔ البتہ وہ قریب قریب ہمیشہ صرف نیچے کا حصہ کھلا چھوڑ دیتے اور اوپر کھائے بنا کے دروازے میں اسی شان پیدا کرتے تھے جو ان کے عرض و ارتفاع سے بھی پیدا نہ ہوتی تھی، غوطی معماروں نے کوشش کی کہ اپنے بڑے دروازوں کو اوپر سے خوب جھکاؤ دے کے بنائیں اور اسلی درجے کی نقاشی اور تصاویر سے انھیں مزین کریں جس سے اصل دروازے کا پیمانہ بڑا کئے بغیر وہ جن شوکت پیدا ہو سکے جو ان کی بڑی بڑی عمارتوں کے شایان شان ہو۔ بایں سہمہ اس مشکل سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا اسلامی معماروں کے حصے میں آیا جنھوں نے ایک نیم گنبد بنا کے عقبی رخ میں ایک یا تین یا پانچ یا سب سے آمد و رفت کے راستے چھوڑنے شروع کئے جو بجائے خود متوسط عرض و ارتفاع کے ہوتے تھے لیکن اس گنبد کے اضافے سے مجموعی طور پر جو دروازہ مرتب ہوتا، وہ اصل راستے کے عرض و طول کو بھلا دیتا اور پورے دروازے کو بڑی سے بڑی عمارت کے شایان شان بنا دیتا تھا۔ اب دیکھئے والا پہلی ہی نظر میں یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ صرف دروازے کے کام کے واسطے ہے اور اسی کے ساتھ نیچے جو اصلی راستے چھوڑے گئے ہیں، ان کے چھوٹے یا بڑے پیمانے کا اسے کچھ خیال بھی نہیں ہوتا کیونکہ دروازے کا پیمانہ اوپر کا نیم گنبد بن جاتا ہے اور اسی کے پیمانے کے مطابق دیکھنے والے کا تصور پورے دروازے کی عظمت و شان کا اندازہ کرتا ہے جو

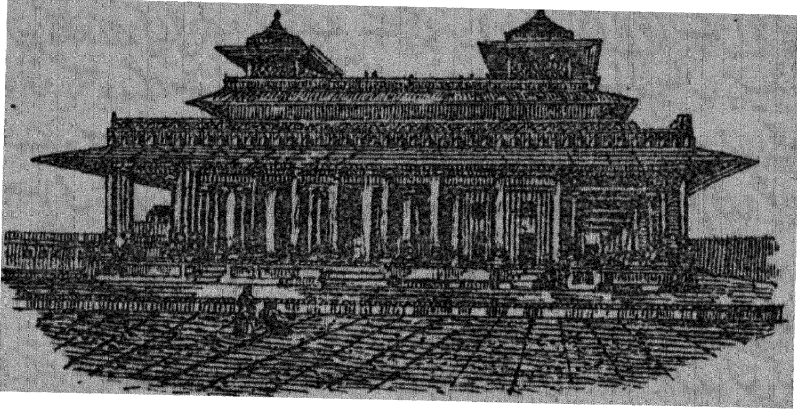
مسلمانوں کے قریب قریب ہر بڑے دروازے اور ہر عہد میں اسی اصول سے کام لیا گیا ہے اور ہمیشہ حسب دستور و نتیجہ برآمد ہوا ہے بلکہ بعض مقامات پر اس فنچورسکری کے دروازے سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی ہے اگرچہ بنجانے خود اس عمارت میں ایسا متناسب موجود نہ ہو جیسا کہ یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال اس دقت تک جتنے طرز ایجاد ہوئے، ان سب میں اچھا یہی اسلامی اصول ہے اور اصول کی صحت نے ان کامیابی کو ایسا ہی دشوار بنا دیا ہے جتنی غلط اصول کی صورت میں کامیابی محال ہوتی ہے۔

غرض مجموعی طور پر فنچورسکری کی نقیض عمارت ایک شاعری ہے جو پتھر میں کی گئی ہے اور جس کی نظیریں کم بلکہ بہت ہی کم کہیں مل سکتی ہیں۔ پھر یہ کہ کسی اور ذریعے سے بانی کی عظمت اور طبیعت کا ایسا واضح اندازہ نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس عمارت سے بلا دقت ہو جاتا ہے۔

اس بادشاہ کا اگر سے سے بھی زیادہ اور عجب نہیں کہ فنچورسکری ہی کے برابر پسندیدہ مقام الہ آباد تھا۔ لیکن انگریزوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا جس سے یہاں کے قابل دید آثار قریب قریب محو و نابود ہو گئے۔ ان میں سب سے خوبصورت چنیر چالیس ستون نامی عمارت تھی جس کے نیچے کی منزل میں اندر کی گتہ میں ۱۶ اور گرد کے بیرونی دالان میں ۴۴ ستونوں کی قطاریں تھیں۔ دوسری منزل، اندرونی دالان کے اوپر اتنے ہی (یعنی ۱۶) ستون اٹھا کے بنائی اور ان پر گنبد قائم کیا تھا۔ یہ عمارت بالکل محو ہو چکی ہے اور اس کے سنگ خشت قلعے کی مرمت میں لگا دیئے گئے ہیں البتہ سطح حالت میں، ایوان شاہی ابھی تک سلامت ہے جس کی

۱۔ فنچورسکری کی عمارت کی پیمائش اور تصویر کشی وغیرہ نہایت خوبی سے ایڈمنڈ ہسٹھ نے چار جلدوں میں کی ہے جس میں ۴۰۰ سے زیادہ لوصیں اور متعوضات شامل ہیں۔ اس کتاب کو حکومت ہالک شمال مغربی ( = موجودہ یوپی ) نے ۱۹۴۲ء میں الہ آباد سے شائع کیا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو ( Les monuments de L, Inde ) از جی لے بول پو

ذیل میں ہم نے تصویر دی ہے۔ انگریزوں نے اسے اسلمہ خانہ

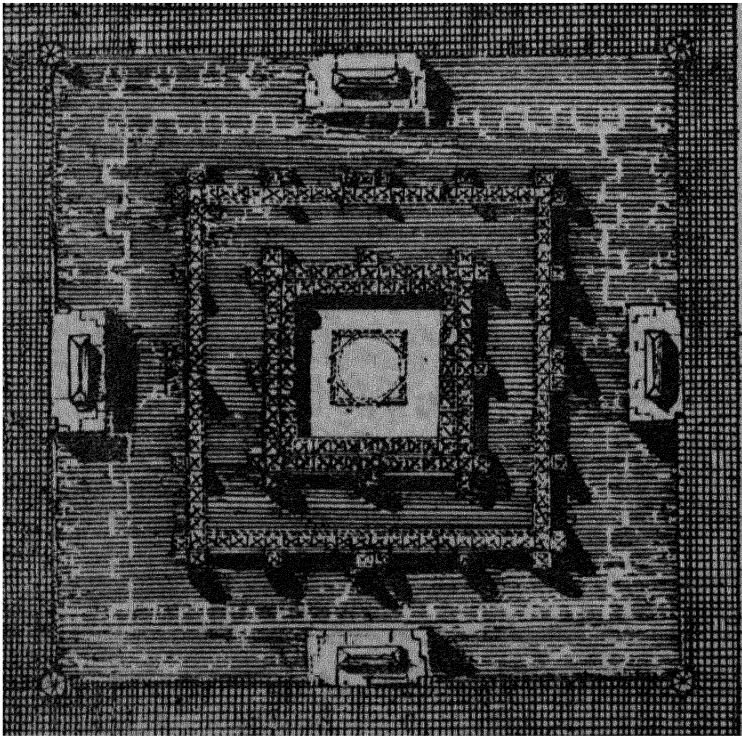


تصویر ۲۲۶

بنادیا تھا اور اس کے پیش والاں کے ورائینٹ سے چن دیئے تھے ان میں انگریزی نمونے کی کھڑکیاں بنائیں اور اس کے قدیم اور قابل دید کمانچے توڑ پھوڑ دیئے۔ اندر بھی جس چیز کو آسانی سے توڑا نہ جاسکا اس پر بڑے اہتمام سے صند لاکرا کے سفیدی پھیر دی گئی اور اصلی نقش و نگار کو بالکل چھادینے کی غرض سے چٹر کے تختے جڑا گئے اسلمہ رکھنے کی الماریاں اور کھونٹیاں بنادی گئیں۔ ان سب تصرفات کے باوجود اس کا نقشہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ستونوں کی آٹھ قطاروں کا مربع ایوان ہے جس کی ہر قطار میں ۸ اور اس طرح کل ۶۴ ستون ہیں۔ گرد کے عریض برآمدے میں دھڑے اور کونوں پر چار چار ستون ملا کے نصب کئے ہیں اور ہر ایک کے سرے کو دیوارگیری کی صورت میں پھیلا دیا ہے جو انتہا درجے کی خوبصورت اور پر تکلف نمونے کی بنائی ہیں اور مجموعی طور پر ان کی وضع ایسی عمدہ اور نقش و نگار اتنے اعلیٰ درجے کے ہیں کہ ہندوستان بھر میں کہیں ان سے بہتر نہ ہونگے، لیکن آکبر کے عہد کی سب سے خاص و ممتاز عمارت غالباً اس بقعے کو سمجھنا چاہئے جو اس نے آگرے سے پانچ میل شمال مغرب میں بمقام



سکندرہ اپنے واسطے بنانا شروع کیا اور ہندوستان کے تمام مقبروں سے جو پہلے یا بعد میں بنے اس کا طرز جداگانہ رکھا۔ میرے نزدیک اس نے یہ وضع ہندوؤں کی یا زیادہ صحیح یہ ہو گا کہ، بدھوں کی تقلید میں اختیار کی تھی۔ کہتے ہیں یہ میں برس تک بتا رہا اور ۱۳۱۲ء میں تکمیل کر پہنچا۔ یہ ایک وسیع باغ میں ہے جس کا دروازہ بھی دیکھنے کے قابل بنایا ہے۔ باغ کے وسط میں ایک اونچے چوترے پر مقبرہ، مخروطی وضع کی عمارت ہے جس کی زیرین منزل گوشوں کے بڑے چھوڑ کر ہر جانب سے ۳۲ فٹ ہے۔ یہ سنٹرل ۳ فٹ بلند ہے اور اس کے ہر رخ پر دس دس بڑی کمانیں ہیں جس کے وسط میں رنگین سنگ مرمر کے چار خانے سے ایک کمال تر کمان داخلے کے لئے بنائی ہے۔



(تصویر نمبر ۵۲۷)

لے اس قبر کے کا کوئی نقشہ۔ تاہم جہاں تک مجھے معلوم ہے شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ اسے ہمارے

یہ منزل گویا ایک اور چوترہ ہے جس پر دوسرا درجہ تعمیر کیا ہے۔ اس کا ہر ضلع ۱۸۶ فٹ کا اور بلندی ۱۸ فٹ ۹ انچ ہے۔ اس کے اوپر تیسری منزل، ۱۵ فٹ ۲ انچ اور پھر چوتھی منزل ۱۸ فٹ ۶ انچ اونچی بنائی ہے اور یہ سب سرخ (بھیر بھرے) پتھر کی ہیں بلکہ اس آخری منزل کے اندر اوپر سنگ مرمر کا احاطہ پہنچ دیا ہے جس کا ہر ضلع ۵۵ فٹ، یا نیچے کے چوترے سے ٹھیک نصف ہے اور اس کے بیرونی جانب پورے دور میں نہایت دلکش نقش و نگار کی مرمریں جالی بنادی ہے۔ اس کے اندر اسی قسم کے مصالحوں کا دالان یا حجرہ بنایا اور اس کے وسط میں اونچا چوترہ تیار کیا ہے جس پر بانی مقبرہ کی قبر کا تعوید ہے اور یہ خود نفیس ترین خطاطی اور سنگ کاری کا بے مثل نمونہ ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ مدفن نہیں بلکہ عین اس مقام کے نیچے جو مقبرے کی جوتی کا سامان زینت سے اور عمارت کی بالکل بنیادیں ۲۵ فٹ مربع کا ایک محرابی حجرہ بنا کے، اس بادشاہ بزرگ کے جسم خاکی کو سپرد خاک کیا گیا تھا۔

پہلی نظر میں خیال ہوتا ہے کہ اس عجیب اور خلاف معمول مقبرے کا نقشہ یا تو بنانے والے بادشاہ کی محض ترنگ تھا یا کسی بیرونی ملک سے لایا گیا ہوگا۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ براہ راست کسی قدیم بدھ دیہارا کی نقل ہے جو ممکن ہے اگبر کے زمانے میں سلامت رہی ہو اگرچہ اس سے بجائے خانقاہ کے اور کوئی کام لیا جاتا ہو۔ مثلاً اگر ہم ٹالا پورم کی بڑی رتھ کی تصویر سامنے رکھیں جو اس کتاب کی گذشتہ جلد میں پیش کی جا چکی ہے، تو معلوم ہوگا کہ اس عمارت میں اتنی ہی منزلیں اور ان میں وہی تناسب

بتدہ حاشیہ ص ۱۰۰ گذشتہ۔ (یعنی انگریزوں کے) قبضے میں آئے ہوئے ایک صدی کے قریب زمانہ گزر چکا ہے۔ مذکورہ تین پائنتیس خود میر کی ہی ہیں اور گویہ بجائے خود درست ہوں لیکن اتنی تفصیلی نہیں ہیں متوجی کہ ایسی یادگار عمارت کی ہونی چاہئے تھیں اور اگر کسی دوسری فرنگی قوم کے ہاتھ میں ہوتی تو اس صورت میں ہم بھی کہتیں:

رکھا ہے جو اس سنگتراشیدہ کا ہے ایک مقررے کی بالائی منزلوں پر جو خوبصورت برجیاں بنی ہوئی ہیں وہ صاف صاف ان مجروں کی یاد دلاتی ہیں جو مذکورہ بالا تھ کی ہر مہتابی کے کنارے پر موجود ہیں اگر مقررے کی سب سے اوپر کی منزل یعنی تنوید قبر کے اوپر قبہ دار حجرہ ہوتا تو تھ سے مشابہت اتنی کامل ہو جاتی کہ شخص ملاؤقت اسے پہچان لیتا اور مجھ کو تو پورا یقین ہے کہ اس قسم کا گنبد اصل نقشے کا جزو تھا۔ کیونکہ ہندوستان کے کسی شاہی مہر میں سنگ فراکشیں اس طرح زیر ماکھلا ہو رہے نہیں دیا گیا ہے۔ دوسرے اوپر کے اٹارے کے وسط میں ۱۴ فیٹ مربع کا جو اوچا چبوترہ بنا ہوا ہے یہ اس قدر نمایاں طور پر گنبد کی بنیاد معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی غرض یہی ہوگی جو وہ حالت میں مقررے کی چوٹی تھی منڈی منڈی اور بے سنی نظر آتی ہے عمارت کی پوری بلند سی گوشوں کی برجیوں کی چھت تک سو فیٹ ہے۔ اب اگر اس بنیاد کے تناسب سے جسے میں نے گنبد کا آثار فرض کیا ہے وسط میں گنبد بنا تو عمارت ۲۰ یا ۲۴ فیٹ اور بلند ہو جاتی اور اس کے حسن و تناسب میں جو کمی معلوم ہوتی ہے وہ نہ رہتی بلکہ وہ جزئیات کے اعتبار سے حتمی خوبصورت ہے اتنی ہی پوری شکل کے لحاظ سے خوبصورت ہو جاتی ہے اور اس طرح مکمل ہو کر ہندوستان کے مقبروں میں روضہ متاد محل کے بعد سب سے بہتر مقررہ شمار ہوتی ہے۔

## جہانگیر ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء

جہانگیر کے باپ اور بھرنے نے جتنا کچھ کام کیا ہے اس پر نظر کیجئے تو حیرت ہوتی ہے کہ جہانگیر نے ہندوستان کی تاریخی شان و شوکت میں اتنا کم حصہ کیوں لیا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو گا کہ اس بادشاہ کے دل میں تمیم کا وہ لولہ نہ تھا جو اکبر و شاہ جہاں کی خصوصیت ہے لیکن ایک سبب یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اس نے اپنے زمانے میں لاہور کو نائے تخت

۱۷۹۱ء اس کے رئیس نقش و نگار کی یاد بقصور میں نو کرائس اینڈ ڈرائنگز آف مہولیکل بلڈنگز (انگریزی، ۱۷۹۱ء) میں شائع ہوئی ہیں ۱۷۹۱ء اور کی تصویر کشنے کے بعد مجھے ستر فٹ کے مدوزا مجھے میں ذیل کی عبارت ملی جسے دیکھ کر مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ یہ شخص کئی سال تک آگرے میں رہا اور اس نے یہ مقبرہ بظاہر آخری مرتبہ ۱۷۹۱ء میں دیکھا تھا۔ اور کی پہلی تک اس کی سب کیفیت صحت اور تفصیل سے بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ جب میں آخری مرتبہ یہاں آیا تو مقررے کے اوپر صرف ایک قیمتی شامیانہ لگا ہوا تھا لیکن اب اس پر محراب دار

نالیاتھا اور ۶۲۲ھ سے اپنی وفات یعنی ۶۲۷ھ تک اس کا دربار اگر وہ دہلی کی بجائے زیادہ تر  
اسی شہر میں رہا۔

عہد جہانگیر کی عمارتوں میں سے قائد اگرچہ جہانگیری محل کا اوپر ذکر اچکا ہے جس کی نسبت  
کہا جاتا ہے کہ اوائل عہد حکومت میں جہانگیر نے بنوایا۔ تو محل کی سرے کا، جو جالندھر  
سے ۱۶ میل جنوب میں ہے، خوشنادر وازہ بھی اسی نے ۶۲۷ھ میں تعمیر کرایا یہ شاہ لاہور باغ اور  
سرہی نگر کے قریب کے گرانی مکانات ۶۲۲ھ میں بنے۔ لاہور میں آثار ملی کا مقبرہ تعمیر ہوا۔  
یہاں کے قلعے میں اکبر نے جو عمارتیں بنوائی تھیں ان میں مشرقی خوابگاہ اور تین گنبد والی سنگ  
رکی وہ متوقی مسجد بھی اسی نے بنوائی جو اگرچہ سیدھی سادی ہے لیکن فن تعمیر کے اعتبار سے  
دیکھ پ ہے۔ خوابگاہ ایک مستطیل ایوان ہے جس کا طول تقریباً ۱۴ فٹ اور شمالی حصے  
کے وسط میں ایک بلند گمانچہ بنا دیا ہے، جہاں سے اس وقت دیاے راوی سامنے  
نظر آتا تھا اور گوشوں میں دو کمرے ہیں جن کے ستون ہندوئی وضع کے نقش و زکار  
سے بھر پور ہیں۔ باقی تین جانب دالات بنے ہوئے ہیں جن کے ستون سنگ سرخ کے ہیں۔  
اور ان کی دیوار گیریوں پر ہاتھی، مور وغیرہ مقبول عام جانوروں کی تصویریں بنائی ہیں  
جیسی کہ اگرے کے لال محل میں نظر آتی ہیں مگر اس کا اور قلعے کے اندر کی دوسری شاہی  
عمارتوں کا (انگریزوں نے) مطلق پاس و لحاظ نہیں کیا بلکہ فوجی معاشرت کی آسائشوں  
کے لحاظ سے ان میں سرتاپا تغیر و تصرف کر دیا گیا ہے۔

جہانگیری محل کے جنوب میں شاہجہاں نے اپنا دیوان عام تیار کیا اور مغرب میں  
جہانگیری محل کو بڑھا کر ایک چھوٹی خوابگاہ بنوائی جس میں مرمریں محرابوں اور جالی کے کام  
کی دو حسین بارہ درمی ہے جو ایک زمانہ تک چھاؤنی کے گرجا کا کام دیتی رہی قلعے کے شمالی رخ پر

بقیہ حاشیہ گوشہ - (گنبد یا) چھت بننے والی ہے جس میں نہایت نادر سفید وریجن سنگ مرمر کی  
چٹائی ہوگی اور اندر تمام چھت سونے کی اور مرصع بنائیں گئے۔ (پراس جلد اول - ۴۴۰)

۱۵ اس کے باپ اکبر کا بھی ۱۵۸۲ء سے ۱۵۹۵ء تک چودہ برس سترہ ہیں رہا۔ اسی نے قلعے کی  
مرست کرائی، مشرقی سرے پر اکبری محل اور دیوان عام بنایا جب نہد کر دیا گیا ہے شہر کا بلور وازہ اکبری بازار  
بھی اسی بادشاہ کی یادگار ہے اس کے عہد کے دوسرے آثار بھی لاہور میں مل سکتے ہیں اگرچہ بعد کے تصورات نے ان کو بہت کچھ  
مسخ کر دیا ہے۔ اسے کول کی "بلند عزان دی چاب میں اس کی عکسی تصویر موجود ہے۔

"سمن بُرج" اور اسی میں شاہجہاں دا وزنگ زیب کا بنوایا ہوا پیش محل ہے اس میں کھڑے بھی کچھ اضافہ کیا تھا اور وہ تو لکھا بارہ دری جس میں جواہرات جڑ کے پھول بنائے تھے اور بے شبہ زر کثیر خرچ کیا گیا ہو گا۔ قلعے کے مغرب میں ایک چوک خلیوی باغ کہلاتا ہے جس کے اندر رنجیت سنگھ کی بارہ دری بنی ہوئی ہے اور جس سے بادشاہی مسجد کو راستہ جاتا ہے۔ یہ مسجد سرائے میں اورنگ زیب نے تعمیر کرائی اور اس کا ذکر آگے آئے گا۔

شہر لاہور میں بڑی مسجد وزیر خاں کی ہے جو پنجاب کے صوبہ دار حکیم علی محمد الدین نے شاہجہاں کے عہد میں بنوائی۔ یہ ایرانی طرز کی ہے اور اوپر چینی اسٹے جو کے چن دیئے ہیں جو مختلف گہرے رنگوں کے ہیں لیکن کچھ خوش وضع نہیں البتہ اس کی حشتی دیواروں پر بڑی خوبصورتی سے قلم کاری کی ہے۔ جسے "کشی" کہتے ہیں اور جو دراصل چینی سے چار خانے ہی کی ایک قسم ہے۔ خود جہانگیر کا مقبرہ لاہور سے کوئی ۶ میل دور شاہدرے میں اس کی سلیقہ مند و عالی ذہان لکھنؤ جہاں نے بنوایا اور اس بادشاہ کی دوسری عمارات سے شان و شوکت میں کچھ گرا ہوا نہ تھا مگر دوسری عمارتوں کی طرح اس نے بھی بہت آئین جھیلی ہیں۔ مقبرے کے گرد ایک وسیع باغ ساٹھا ایکڑ تک چلا گیا تھا۔ بت مایں اس کی چار دیواری کے ہر رخ بڑے بڑے دروازے بھی بنے ہوئے تھے اور ان میں ترائے کے صحن سے گزر کے جانب مغرب جو دروازہ کھلتا تھا اس کی سناٹ مرمر کی محراب تقریباً ۵۰ فٹ بلند تھی۔ اصل مقبرہ ایک بچی کرسی دے کے بنایا ہے یہ ۲۵ فٹ مربع اور اس کے اوپر پھر ۲۰ فٹ مربع کی ایک مہتابی کوئی ۲۰ فٹ بلند ہے اور اس پر تین تین درجے کے ہشت پہلو مینار اٹھائے ہیں

سہ محسن جہنم کا بگڑا ہوا ہے۔ روایت مشہور ہے کہ پہلے اس جگہ نہایت مالیشان بہت پہلو برج بنا ہوا تھا جو ۵۰ ہے، ایل کپٹنگ نے اس قلم کاری کی کیفیت لکھی ہے اور مسجد کے خوبصورت دروازے اور بعض نقش و نگار کی عکس تصویریں بھی بنائی ہیں (جول آف انڈین آرٹ اینڈ انڈسٹری - دوم، ۱۷)

جن کی برجیاں سنگ مرمر کی ہیں۔ کرسی سے برجیوں کے کلاس تک ان میناروں کی بلندی ۵۵ فٹ ہو گئی ہے۔ مقبرے کے ہر طرف محرابی والان ہیں جن کے وسط میں ایک بڑی کمان اور اس سے ملے ہوئے اندر جانے کے راستے اور پھر دونوں طرف پانچ پانچ بنیلی کمانیں ہیں۔ والانوں کے عقب میں کل ۴۰ حجرے ہیں جن کا ایک ایک رخ دوسرے دو دو تسطیل نما حجرہ میں جانے کا راستہ ہے اور ان تسطیل حجرہوں سے گزر کر اصل قبر کے حجرے تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح قبر کے ہر طرف ۵۶، ۵۶ فٹ آثار کی ٹھوس دیواریں محیط ہو گئی ہیں۔ قبر کا تو ذرا سنگ مرمر کا ہے جس میں قیمتی سنگینے بڑے ہوئے ہیں۔ یہ وسطی حجرہ مہشت پہلو ہے۔ اور اس کا عمود ۱۱ فٹ اور بلندی ۱۱ فٹ ہے۔ اس حجرے کی چھت پر سنگ مرمر کے چار خانے کی ۳۲ فٹ مربع مہتابی بنائی ہے جس کی مرمری منڈیر کو رنجیت سنگھ توڑ کر لے گیا تھا مگر اب وہ پھر اپنی جگہ نصب کر دی گئی ہے۔ ساری عمارت سرخ (بھیر بھرے) پتھر کی ہے مگر جاہ جاسنگ مرمر کی بھی کاری کی گئی ہے اور تمام کام حسن مذاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں اگرچہ میناروں کے درمیان کی پیچھی پیشانی حسن تعمیر کے اعتبار سے کچھ زیادہ موثر نہیں ہے۔ اس عمارت کے مغرب میں سرائے اور اس کے آگے نورجہاں کے بھائی آصف خاں کا جس کا سنگلہ میں انتقال ہوا، مہشت پہلو مقبرہ ہے۔ پھر ریل کی پٹری کے دوسری طرف خود ملکہ نورجہاں کا مقبرہ ہے مگر ان دونوں کے سنگ مرمر اور قیمتی سنگینوں کو رنجیت سنگھ نے اکھڑا لیا تھا۔

۱۔ اگرچہ بہت چھوٹے پیمانے پر ہے تاہم مقبرے اور باغ کا خاکہ مجرکول کی لوح سے گزرتے اپنے مجموعہ تصاویر عمارات تاریخی میں شائع کر دیا ہے (لوح نمبر ۶۹ تا ۷۷) ۲۔ تھورن ٹن کی کتاب لاہور اور سید محمد لطیف کی کتاب لاہور میں اس مقام کے تفصیلی حالات درج ہیں ۳۔

ممالک محروسہ کے دوسرے سرے پر جہانگیر نے گور کو چھوڑ کر  
ڈھاکہ میں نیا صدر مقام تیار کیا اور کافی وسعت و شان کی متعدد  
عمارتوں سے اس کی زیب و زینت بڑھائی۔ مگر یہ بیشتر خشتی تھیں اور  
سنگ مرمر میں کمران کی لپائی کر دی گئی تھی۔ صرف ستون اور تونڈے  
البتہ پتھر کے لگائے نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ سب بہت شکستہ و رنجتہ ہو گئے ہیں  
اور گو کثرت اشجار میں بھی جن کی جڑیں دیوار و در کے ٹکڑے اڑائے دیتی  
ہیں، جھانک کر دیکھئے تو ان کے حسن تنوع کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے،  
بایں ہمہ یہ آثار اس قابل نہیں ہیں کہ شمالی صدر مقامات کی سنگین و  
مرمری عمارات کے مقابلے میں پیش کئے جائیں۔

مگر جہانگیر کے زمانے کی ایک عمارت ایسی ہے کہ گو اس بادشاہ نے  
تعمیر نہیں کرائی تاہم اُسے دو سبب سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک تو حسن عمارت  
کی بنا پر اور دوسرے اس لئے کہ یہ جس عہد میں بنا اس کے طرز تعمیر کے کمال  
کی یاد نگار ہے۔ یہ اگرے میں اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے جسے نورجہاں نے  
اسنے باب کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا اعتماد الدولہ کا انتقال ۱۶۲۱ء میں ہوا  
اور مقبرہ ۱۶۲۹ء میں اتمام کو پہنچا۔ یہ دریا کے بائیں کنارے پر ایک باغ  
کے وسط میں بنا ہوا ہے جس کی چار دیواری کا ہر ضلع ۴۰ فٹ ہے۔  
سج میں اونچے چوترے پر مقبرے کی اصل عمارت ہے جس کا ہر ضلع ۶۹ فٹ  
تھے۔ اس کی دو منزلیں ہیں اور ہر زاویے پر بہت پہلو برج بنا کے اس کے  
ادھر کھلی ہوئی بُرجاں بنا دی ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ چونکہ کچھ بہت پست  
رہ گئے ہیں اور یوں بھی دیکھئے تو عمارت کی شکل میں اتنی خوشنالی بھی بشکل  
پائی جاتی ہے جتنی کہ اسی نواح کے اور معمولی سے مقبروں میں موجود ہے۔  
حقیقت میں اگر کہیں یہ عمارت سرخ پتھر کی ہوتی، یا اس میں ہمالیوں کے  
مقبرے کی طرح سنگ مرمر کی کچی کا کام بھی ہوتا، تو بھی اس پر حیند اس  
توجہ نہ کی جاتی۔ لیکن اس کی اصلی خوبی یہی ہے کہ سلاطین سنگ مرمر کی  
بنی ہوئی ہے اور اوّل سے آخر تک قیمتی ٹیکسٹوں سے وہ کچی کاری کی گئی ہے

جو بظاہر پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اور اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ ہندوستان  
سبحر میں اس طرزِ آرائش کی ایک بہترین مثال پیش کرتی ہے۔  
معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے ابتدائی حصے میں اطالوی،  
خاص کر فلورنس کے کاریگر ہندوستان میں روشناس ہوئے اور کہا جاتا  
ہے کہ انہی نے ہندوستانیوں کو سنگ مرمر میں بچھنے یا جواہرات جڑنے  
سکھائے۔ لہٰذا فیتھورسکیمری میں بچھنے کی کچی اور نہت کاری دونوں کی

لے اس صنعت کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، اسی، ڈیو اسٹیک کی کتاب ”مئل کلر ڈیویشن آف انڈیا“  
(صفحات ۱۸، ۲۰ وغیرہ) اور جنرل آف انڈین آرٹ انڈیا ٹرسٹی، جلد ششم، ۱۹۱۲ء وغیرہ۔  
لے ایک نماز میں یہ بات یورپ میں بالکل مسلم تھی مگر اس کی کوئی بلا واسطہ شہادت پیش نہیں کی گئی۔ صرف  
ایک فنی کاریگر، اسٹن یا اوٹن (دور دو) کا نام ان تیسری کاموں کے سلسلے میں مل سکتا ہے جسے شاہجہاں  
نے دہلی میں نوکر رکھا اور گمان کیا جاتا ہے کہ تفیل کی تصویر کے نمونے پر آپالو کے جاوروں سے کھینچنے کی تصویر  
جو دہلی میں تخت شاہی کی زینت تھی اور جنوبی لنگاٹ ٹن کے تحفہ ہند میں ایک عرصہ تک رہی اور پھر لاڈلہ گڑ  
نے اسے وہاں سے لاکے اپنی پہلی جگہ چمبوا دیا، وہ اسی کاریگر کی بچھنے کاری تھی، لیکن رسالہ ”نان ٹینٹہ  
سین چوری اینڈ فز“ (بات سن ۱۹۲۹ء ایلیہا) میں ملکتے ایکول آف آرٹ کے استاد  
مسٹر جیول نے دلائل پیش کی ہیں کہ بچھنے کاری اصل میں عربی اور ایرانی منامی ہے اور خاص عربی طرز  
کے باریک مرغونوں اور ایرانی صنعت کے متداول موضوعات جیسے گلاب پاش، سرو و منو بڑ وغیرہ ایشاک  
حوالہ دیا ہے جو اس صنعت کی خصوصیات ہیں۔

جہانگیر کے ابتدائی دس سال (۱۶۰۶ء تا ۱۶۱۱ء) یعنی سکندرے میں مقبرہ اکبر کے دروازوں کے  
تیار ہونے تک رنگین سنگ مرمر کی کچی کاری کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ بچھنے کاری یا جڑت کے نمونے  
کم ہیں۔ اعمام والدہ کے مقبرے میں دونوں منتیں کامل صورت میں موجود ہیں (۱۶۱۱ء تا ۱۶۱۶ء) (صفحہ  
متبادل) اور اکبر آباد دہلی کے محلات میں جواہر جہاں نے بنوائی سنگ مرمر کی کچی کاری بالکل غائب ہے۔  
اور بچھنے کاری نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اس کے کچھ پہلے صنعت جسے (”Pietra dura“) کہتے ہیں  
فلورنس میں ایجاد اور نہایت درجہ قبول عام ہوئی بلکہ فی الواقعہ سارے یورپ میں پھیل گئی۔ یہ بھی سچ ہے کہ  
جہانگیر شاہجہاں کے زمانے میں اطالوی کاریگران کی ملازمت میں تھے لیکن اس کی کوئی تفصیل شہادت



مثالیں موجود ہیں اور سکندر کے مقبرے میں جا بجا کچی کی ہوئی ہے۔ لیکن عہد شاہجہانی میں یہ شے طرز تعمیر کی خصوصیت بن گئی اور اس کے محلات و مقابر دونوں کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ ہے کہ اس جدوجہد سے ان میں نہایت خوشنما طرز سے کام لیا گیا ہے۔

اس امر میں شبہ کیا گیا ہے کہ یہ نئی صنعت واقعی باہر سے آئی یا ہندوستان ہی کی ایجاد تھی۔ لیکن فن تعمیر کے ایک اساسی نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیا جاتا تو شاید یہ سوال پیدا ہی نہ ہوتا۔ مثال کے طور پر ہم (انگریز) جو خود اسی فن نہیں رکھتے۔ اگر کسی یونانی یا رومی ستون کی نقل یا کسی عہد وسطیٰ کی اطالوی کمان کی جزئیات اخذ کرتے ہیں، تو ہم اسے اپنے ملک کے موسم یا اپنی ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ بعینہ نقل اُتار لیتے ہیں۔ لیکن جس وقت کوئی قوم جس کا اپنا ایک مستقل طرز ہے، دوسرے طرز کی کوئی خاص چیز یا طریق کار اختیار کرنا چاہتی ہے تو محض نقل نہیں کرتی بلکہ اسے مناسب حال اس کو ڈھال لیتی ہے۔ ہم اہل اطالیہ کی کچی کاری کا رواج ہونے دیتے تو اس کے ساتھ ان کے (Cinque-cents) سولہویں صدی کے تعمیری نقش و نگار تک بحسنہ قبول کر لیتے۔ مگر ہندوؤں نے نئے مصالحے اور نئے طریقوں کو، خواہ وہ کہیں سے آئے ہوں، ہاتھ میں لیا تو وہ وہ نمونے تیار کرنے لگے جو عہد کبدری کے معماروں کے مقبول عام پتھر کے نقش یا سنگ مرمر میں کچی کے کام میں نظر آتے ہیں۔ پھر ہر وضع اس مقام کے مناسب اختیار کی، جہاں اس سے کام لیا جا رہا تھا۔ طرز عمارت وہی (ہندوستانی)، اور نقوش تک سب وہی رہے البتہ مصالحہ بدل گیا۔

بقیہ حاشیہ مرقعہ گزشتہ۔ نہیں ملتی کہ انھیں کوئی بااثر عہدہ دیا گیا تھا یا کہ روضہ نماز محل کی جس کا نقشہ غالباً ایران کے پناہ گزین امیر علی مردان خاں نے مرتب کیا تھا۔ تعمیر کے زمانہ میں شیلز، سبدا، سمرقند اور قمنوج کے مصالح کا ذکر آتا ہے کہ وہ بڑی شہرت دماویری رکھتے تھے؛

اور گل بوٹوں میں بھی سنچے مصالحوں کے نازک و خورد تر ہونے کے باعث ضروری ترسیم و تبدیلی کرنی پڑی۔  
 اعتماد الدولہ کا مقبرہ اس وضع کا پہلا نمونہ تھا اور اس لئے یقیناً سب سے کم کامیاب رہا۔ نئے نقش و نگار اپنے مقام پر کچھ بہت موزوں نہیں نظر آتے اور بیچ میں جو فصل دیئے ہیں وہ ہر جگہ اس وضع میں کھیلے سب سے اچھے نہیں ہیں۔ گردوسری طرف دیکھیے تو درجوں کی مرمری تختیوں میں جالی کا جو خوبصورت کام کیا ہے، وہ شیخ سلیم چشتیؒ کے قفقور سیکری کے مقبرے کے کام سے ملتا جلتا ہے۔ پھر اس کی بے حرم مرمر کی دیواریں اس کے نقش و نگار کی بونگھونی، یہ سب اوصاف مل کر ایک ایسا خوبصورت مجموعہ بناتے ہیں کہ اس پر خرد گیری کی مجال صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہم اس کا مقابلہ شاہجاں کی عمارت سے کریں۔

## شاہجاں شاہ ۱۶۲۵ء تا ۱۶۶۷ء

فن عمارت کی ساری تاریخ میں ایک بہ ایک اتنے بڑے تنہ کی نظیر ملنی مشکل ہے جتنا کہ اکبر اور اس کے پوتے شاہجاں کے طرز تعمیر کے درمیان واقع ہوا۔ نہ اتنا بڑا فرق کہیں نظر آسکتا ہے جتنا کہ پہلے بادشاہ کی تعمیر کی مردانہ قوت اور بے اندازہ حدت طرازی اور دوسرے کی انتہائی بلکہ قریب قریب نسائی نازکی اور نفاست میں نمایاں ہے۔ واقع میں ایک ہی قوم کے افراد، جو ایک ہی دین کے متبع تھے اور ایک ہی مقام پر

۱۔ تزکوں نے استنبول پر قبضہ کیا تو کچھ ہی قسم کی تبدیلیاں واقع ہوئی یعنی انھوں نے نصاریٰ کے طرز تعمیر میں اپنی ضروریات کے مناسب تصرف کر لیا اور محض نقالی نہیں کی، دیکھو ”ہرٹس اوٹ۔۔۔۔۔ آرکیٹیکچر“ طبع سوم جلد دوم، ۵۰۷ و ۵۰۸۔

انہوں نے اپنے معابد و محلات بنائے ان کے مابین اتنا بڑا فرق تھا جہاں تک ہمیں علم ہے کسی ملک کی تاریخ میں کبھی نہیں واقع ہوا کہ یہ فرق بھی اگرے کے محل سے بڑھ کر نمایاں نہیں ہے کہ ایک طرف تو اکبر یا جہانگیر کی بنوائی ہوئی سرخ تھمر کی حویلیاں گھڑی ہیں جن میں کثرت سے پیگھر تراشی اور چوکور ہندوآنی ساحت نظر آتی ہے اور دوسری طرف دروازہ کھلتے ہی شاہجہانی حرم سرا کی سفید مرمریں چار دیواری سامنے آجاتی ہے (مسئلہ تا مسئلہ) جس میں سنگی و نگینی کی پوری شان ہے اور اسی کے ساتھ اس خاص نفاست کا نقش بھی موجود ہے جو سوائے مشرق کے اور کہیں نہیں ملتی یہ صحن کچھ بہت لمبا چوڑا نہیں۔ بلکہ صرف  $14 \times 235$  فیٹ ہے تاہم اس کو انتہائی محنت و ہتھام کے ساتھ مکمل کیا گیا ہے اس کے تین رخ بگمات کے مکانات ہیں جن میں کوئی خاص وسعت نہیں نہ موجودہ حالت میں کوئی تعمیری حسن رکھتے ہیں۔ لیکن چوتھا رخ جو دریا کے اوپر چھایا ہوا ہے، ادھر تین سنگ مرمر کی کمال دلاویز حویلیاں ہیں۔ اکثر اسلامی محلات کی مثل اس محل میں بھی سب سے نفیس اور کمال تحمل کے ساتھ آراستہ حصہ حمام کا ہے جو صحن کے ایک جانب بنا ہوا ہے۔ حمام اب منہدم ہو چکا ہے لیکن دیواروں اور چھتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھیں کس سلیقے سے مزین کیا گیا تھا۔

اس کے عقب میں اور محل کے وسط میں ایک اور بڑا چوک ہے جس کا

ساحہ بیال کے بڑے حمام کو مارگوئیں اور ہسٹنگز نے اس غرض سے توڑا تھا کہ لے جا کے جوب جہاں کی نذر کیا جائے ظاہر یہ ارادہ کبھی پورا نہ ہوا لیکن تمام واقعات کی تحقیق اب اس لئے دشوار ہوئی ہے کہ سنگ مرمر کے پورے فرش اور حمام کے باقی باقی اجزاء کو لارڈ ولیم بنٹنک نے تخریب کر دیا اور شاید اسی لگت کی صرف ایک فیصدی قیمت دہل کر لی البتہ ہندوستان کے اہلینس تو قریب تدریک لے گئے کا ایک یہ اعلیٰ ضرورت تھا جس ملک کے ارباب حکومت کی شرت طریت سے کمال درجے مناسب رکھتا تھا۔

طول ۵۰۰ اور عرض ۳۰ فیٹ اور ہر طرف والاٹوں کی قطار بنی ہوئی ہے اس میں پنہنے کے لئے مقابل کے سروں پر چھوٹے چھوٹے کئی خوش وضع چوکوں سے گزرنا پڑتا ہے جن کے دروازے بڑی شان کے بنائے ہیں۔ بڑے چوک کے ایک جانب محل کا صدر ایوان یا دیوان عوام ۲۰۸ × ۶۰ فیٹ تین گہ کے والان دروالان کی صورت میں بنایا گیا ہے جس کی محرابیں خوبصورتی میں لاجواب ہیں۔ یہ تین طرف سے کھلا ہوا ہے اور عقب کی جانب تخت کے لئے شیش زکالائے اس عمارت سے آگے بڑھے تو پھر دو چھوٹے چوک ملیں گے جن میں سے ایک میں دیوان خاص ہے اور دوسرا حرم سرا کی چار دیواریں میں ہے۔ ان میں سے دیوان خاص کا ایوان عہد شاہجہانی کی جیل ترین عمارت میں داخل ہے کہ سر سے باؤں تک اسے بے جرم سنگ مرمر سے بنایا اور رنگ برنگ کے جواہرات جڑے ہیں اور یہ تمام کام اس عہد کی بہترین وضع میں تیار کئے گئے ہیں۔ دیوان میں ایک کھلا ہوا پیش والان اور پیچھے گھبرا ہوا کمرہ بنا ہوا ہے اس کا طول ۶۵ عرض ۳۴ اور بلندی ۲۲ فیٹ ہے۔ پیچھے ترش کر جو نقش کھوے ہیں، وہ نہایت خوب ہیں اور کچے یا قوت سرخ (جست) وغیرہ جواہرات سفید مرمر میں جڑ کر جو پھول بنائے ہیں، وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ اس محل کی ایک اور نظر فریب عمارت، وہ دو منزلہ مرمر کو شک ہے جو دریا کے رُخ ایک گول بروج پر، دیوان خاص و حرم سرا کے درمیان تعمیر کی ہے۔ اس کا طرز شاہجہاں سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے اور اگر جہانگیر نے کوئی چیز یہاں بنائی تو وہ یہی عمارت ہوگی۔ اگرچہ ہمارے چھوٹا ہے لیکن یہاں اس کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو الہ آباد کے قلعے میں چالیس ستون کا ہے اور بڑی عمارتوں سے بھی زیادہ اسے دیکھ کر ان محلات کے بانیو جی

۱۵۸ اب پوری توجہ اور رویہ صرف کیا جا رہا ہے کہ اس عمارت میں جو کچھ پرانی عمارتیں باقی رہ گئیں ہیں ان کی حفاظت کی جائے

انتہائی لطافت ذوق اور نفاست پسندی کا ثبوت ملتا ہے :

## دہلی کا لال قلعہ

ہر چند اگرے کے قلعے کو غالباً بہ اعتبار تنوع اور تاریخی اہمیت کے لکھنا سے قلعہ دہلی پر یقیناً فوقیت حاصل ہے لیکن اس میں ایک دہی غوبی یہ ہے کہ وقت واحد میں ایک ہی نقشے کے مطابق تعمیر ہوا کوہِ سر یہ کہ فنِ تعمیر کے لحاظ سے اسے ہندوستان کے سب سے عالیٰ مرتبہ و تبحر پسند بادشاہ نے تعمیر کرایا۔ اسی کے ساتھ، چونکہ یہ اگرے کی عمارتوں کے کچھ بعد بنا اس لئے ایک سقم بھی آگیا ہے۔ ظاہراً اکبر آباد کی سب عمارتیں مکمل ہو چکی تھیں جب کہ نئے شہر شاہجہاں آباد اور لال قلعے کی تعمیر آغاز ہوئی اور جو کچھ اس نے اگرے میں بنایا ان میں عمارات دہلی کی نسبت زیادہ متانت اور بہتر ذوق کی شہادت ملتی ہے۔ مگر ان اسقام کے باوجود دہلی کا لال قلعہ یا قصر شاہی ممالکِ مشرقِ ہند میں، بلکہ شاید ساری دنیا میں سب سے شاندار و پرستشکوہ محل ہے یا بھی تھا۔ دوسرے کم سے کم ہندوستان بھر میں تو یہی شاہی قصر ہے جسے دیکھ کر رم بجنو کی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک مکمل قصر کی جب کہ وہ پہلے سے سوچ بچار سے یکساں نقشے پر بنایا جائے، ترتیب و ترکیب کیا ہوتی تھی ؟ (دیکھو نقشہ آئینہ)

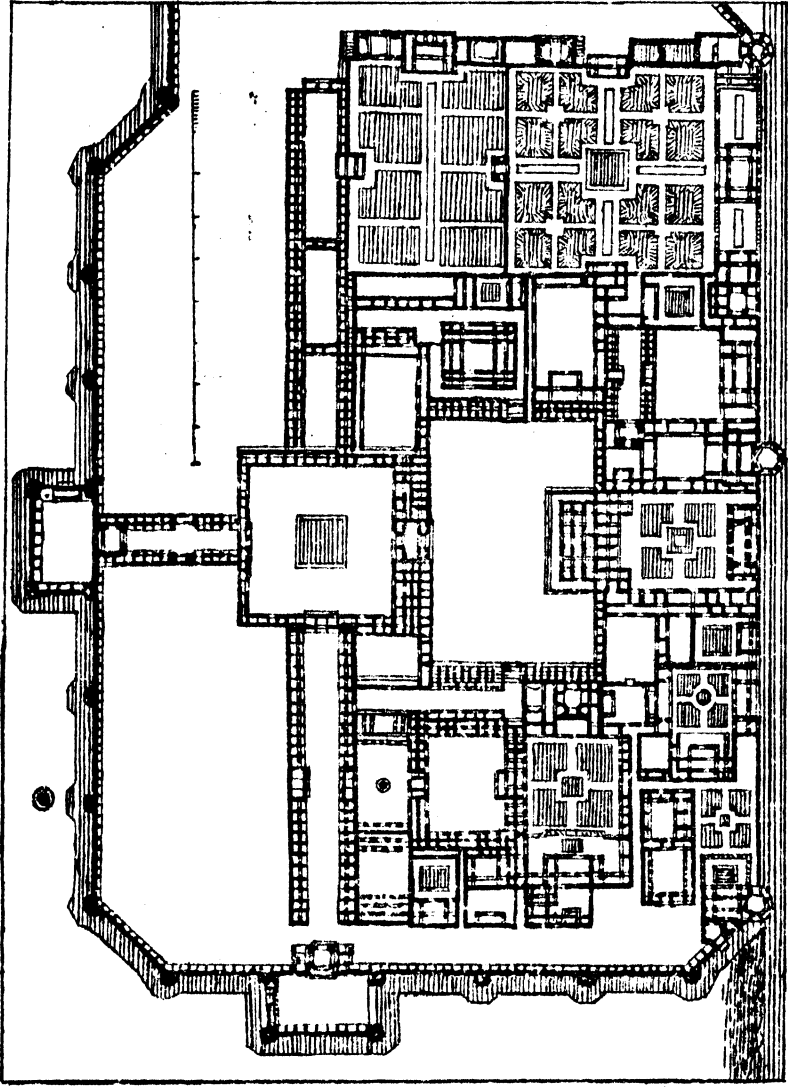
یہ قلعہ جو اگرے کے قلعے کی طرح جہنا کے کنارے واقع ہے،

اس محل کے مکمل نقشے ہندوستان کے محکمہ فوج میں موجود ہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر غیران کی کیفیت کو ذہن نشین پیلے میں لکھنا نہایت دشوار ہے۔ مگر یہی کتاب ”ہند پاک اوف انگرہ“ کا نقشہ گواہی سب مابہر مفید ہے لیکن اوّل تو یہاں بہت چھوٹا ہے دوسرے فنِ تعمیر کی ضروریات کے لحاظ سے اس میں کافی تفصیل نہیں پائی جاتی :

قریب قریب شکل متوازی میں بنایا گیا ہے جس کے صرف زاویئے قدرے خمیدہ ہیں۔ یہ بڑے دروازے چھوڑ کر شرقاً غرباً ۱۶۰ اور شمالاً جنوباً ۳۲۰ فٹ ہے اس کے ہر طرف سُرُخ (بھڑکھڑے) پتھر کی شاندار فصیل کھڑی ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فصل سے قبہ دار برج آتے اور تازہ لطف پیدا کرتے ہیں۔ اندر جانے کا بڑا راستہ یعنی لاہور دروازہ جانب مغرب، چاندنی چوک کے رخ کھلتا ہے جو ایک سیل لمبا نہایت خوبصورت اور فراخ بازار ہے اور اس کے وسط میں نہر اور اس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں چلی گئی ہیں۔ اس بڑی گم کے دروازے کے چھتے سے اندر داخل ہوں تو پہلے وہ لداؤ کا ایوان ملتا ہے جسے نقشے میں ہم نے کت سے دکھا دیا ہے۔ اس کے پہلوؤں کے دو درجے رکھے ہیں اور وسط میں مشن سا بنا دیا ہے۔ ایوان کا پورا طول ۳۷۵ فٹ ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر بہت کچھ کنسی زبردست عوٹھی کلیسا کا نیاز خانہ (وسطی دالان) یاد آ جاتا ہے اور دروازہ مرنے کے اعتبار سے حق یہ ہے کہ دنیا بھر میں اس شان کی ڈیوڑھی کہیں نہیں ملتی۔ مسقف کے اندرونی کمرے دوسری طرف ایک (۳۵۰ فٹ مربع) چوک میں کھلتے ہیں جس کے وسط میں دو طرفہ اور ایوان کی طرح دو منزلہ دوکانیں بنا کے بہت ہی خوشنما بازار تیار کیا ہے (فرس۔ من) مگر اس کی چھت لداؤ کی نہیں ہے۔ بازار کا یہ سلسلہ دائیں بائیں دونوں طرف چلا گیا ہے اور ایک طرف تو دہلی دروازے (ج) میں لٹکتا ہے اور دوسری (یعنی جنوب کی) طرف باغ میں جو میراخیال ہے کہ کبھی مکمل نہ ہونے پایا۔ داخل ہوتے وقت سامنے کے رُخ نوبت خانہ تھا ( )

تصویر برصغیر

۱۷۔ یہ نہر اب مدت سے ماٹ دی گئی اور اس کے کنارے کے درخت کاٹ کر دکانوں کے قریب درختوں کی نئی قطاریں نصب کی گئی ہیں۔ مترجم۔



تصویر ۲۲۱

جس کے بیچے سے گزر کر قلعے کے دوسرے یا صدر چوک میں پہنچتے ہیں۔  
 یہ چوک شمالاً جنوباً ۵۵ فٹ اور شرقاً غرباً ۲۸۵ فٹ ہے۔ اس کے  
 بیچ میں قلعے کی دربار گاہ یا دیوان عام (ب) بہت کچھ آگرے کے  
 دیوان عام کی مثل لیکن شان و سجاوٹ میں اس سے بڑھ کر بنا ہوا ہے۔

آٹھارہ سمیت اس کا طول ۲۰۰ اور عرض ۱۰۰ فٹ ہے۔ وسط میں نہایت پر نقش و نگار شہ نشین بنایا ہے جس میں مرغ و مکمل بہ جواہر مرمریں چبوترے پر بھی وہ شہرہ آفاق سخت طاؤس بچھتا تھا کہ جس کی زیب و زینت اور گراں بہائی غالباً خود جہلم یا ایشیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی بلکہ اس کے عتب میں ایک صحن باغ اور مشرق کی جانب رنگت محل (ج) بنا ہوا تھا جس میں حمام وغیرہ دوسرے کمرے تھے۔ عمارت کا یہ ۱۶ سو فٹ طول سلسلہ پورے قلعے کو دو تقریباً مساوی حصوں میں منقسم کرتا تھا۔ شمالی نصف میں چھوٹے چھوٹے چوک وے کے ان کے گرد بہت سے مکانات غالباً مغرزمہانوں کے لئے بنے ہوئے تھے۔ اسی سلسلے میں دریا پر سایہ افکن وہ دیوان خاص (د) تھا جو شاہجہاں کی عمارتوں میں اگر سب سے خوبصورت نہیں تو سب سے زیادہ آراستہ و زربکار عمارت ضرور تھا بلکہ یہ اگرے کے دیوان خاص

سے تعلق دہلی پر ہمارا (یعنی انگریزوں کا) قبضہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے ہر شخص نے آزادی سے بے روک ٹوک مار چائی انہیں میں ایک کپتان (جو بعد میں سر کے خطاب سے سحرز ہوا) جوش تھا جس نے اس مرمیں جو بڑے حصے کو ادھیڑ اور توڑ پھوڑ ڈالا۔ مگر شکوہ اسے یہ خیال آیا کہ ان جڑاوتیہروں سے کاغذ نشینوں کا کام لیا جائے۔ ان میں سے دو پتھر وہ وطن (ولایت) لایا اور پانسواشرنی میں فروخت کئے۔ انہیں متحف ہند میں رکھ دیا گیا۔ ان میں ایک پر جواہر جڑ کر پرندے بنائے ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ ظونہیں یا کم سے کم اطالوی کاریگروں کا کام ہے۔ دوسری شبہ کا ہم ادیتذکرہ کر چکے ہیں کہ یہ رافیل کی تصویر کی نقل ہے جو خود بھی ایک دوسری تصویر کی تقلید میں تیار کی گئی تھی لیکن رافیل کے ہاں آپالودیتو کے ہاتھ میں رباب (وائولن) ہے اور اصل پرانی تصویریں بربط۔ چونکہ دہلی کی تصویر میں بھی یہ ساز دکھایا گیا ہے اس واسطے دوسرے قرائن موجود نہ ہوتے تو بھی صرف یہی مشابہت اسے اطالوی ثابت کرنے کیلئے کافی ہوتی ہے اسے ۱۶۲۷ء میں آدرشاہ تڑا کر لوٹ لے گیا جو اس کے جنوب میں اور اس کے اور رنگ محل کے درمیان فصیل سے آگے بٹھا ہوا متسن برج شمالی سرے پر شاہ برج اور جنوبی جانب است برج بنا ہوا ہے جو



سے یقیناً وسیع تر اور کہیں زیادہ فرین و مرصع تھا اگرچہ نقشہ تعمیر کے لحاظ سے یہ شکل اسٹائیفیس ہو گا لیکن عام ترتیب میں جو یہ کیف مناسب ہے یا قیمتی نگینوں کی جس حسن کے ساتھ یہاں تزئین و تزیین کی ہے اس نے بہتر کوئی چیز بنانا مکان سے خارج ہے۔ یہی ایوان ہے جس کی چھت کے گرد پیشبور کتبہ کندہ تھا کہ ہے

اگر فردوس برودے زمین است

زمین است و زمین است یہیں است

اور اس کا اگر یہ مطلب لیا جائے کہ کسی محل میں جو اس وقت دنیا میں جو ہے اس بے نظیر حسن و خوبی کا کوئی ایوان نہیں تو یہ دعویٰ کچھ بے جا نہیں بھی نہ ہو گا

اس کے آگے شمال میں قلعے کے باغ زمین تھے جن کو مشرق کے مقبول عام طرز کے مطابق بنایا تھا۔ در شاہ مرمو کی چھوٹی چھوٹی بارہ دریاں چھتیاں اور طرح طرح کے نواروں سے ان کی زیب و زینت بڑھائی تھی کہ اس ملک کے موسم کے لئے ان سے زیادہ موزوں اور باغ میں ان سے بڑھ کر خوبصورت آرائش کے اسباب نہیں ہو سکتے تھے

بازار کے مشرق میں اور وسطی عمارتوں کے جنوب میں جو فصل ہے وہاں حرم سرا اور محل کے زمانہ حصے تھے یہ لکڑیاں ہر رخ سے ایکھڑائیٹ سے لکڑیوں کا جس کے معنی یہ ہوئے کہ این کو ریاں یا یورپ کے اور کسی شاہی محل سے دگنے سے زیادہ رقمہ اس حرم سرا نے تعمیر رکھا تھا۔ قلعے کا جو نقشہ مقامی لوگوں سے مجھے ملا اور جس کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس کی رو سے حرم سرا میں تین چمنستان اور ۱۲۱۲ دوسرے چوک تھے جن کی عمارتوں کو مختلف اعوان سے بنایا گیا تھا لیکن یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ کس قسم کی عمارتیں تھیں۔ کیونکہ اب ان کا اثر آثار تک باقی نہیں ہے۔ قلعہ اگرچہ میں جو محاسن اس بادشاہ نے بنائی ہے، اس پر قیاس کیا جائے تو یہ وہی کی حرم سرا شروع میں خوبصورتی اور صناعی

کے لحاظ سے دیوان عام و خاص وغیرہ سرکاری عمارات سے بھی بڑھ کر ہوگی۔ اگرچہ بہت ممکن ہے کہ برابر استمال میں رہنے کے باعث غدر و فساد تک اس میں رد و بدل کر کے اسے بہت کچھ بد صورت بنا دیا گیا ہو۔ اس لئے کہ آخری سو سال میں لال قلعے کے اندر بھی ذوق ایسا ہی خراب ہو چکا تھا جیسا کہ باہر جس کی شہادتیں لکھنؤ وغیرہ مقامات میں ملتی ہیں۔ اس میں اصل شاہجہانی عمارت آخر تک ضرور موجود رہی ہوگی۔ اور یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اوپر کے کونڑے کو ہٹا کر اصل چیز اس ڈھیر کے اندر سے نکال لی جائے۔ لیکن انگریز حاکموں کے دماغ میں اس خیال کا آنا محال تھا۔ انہوں نے حرمسرایے شاہی کے سارے مکانات کو تحفہ ارض ہی سے محو و نابود کر دیا اور ان انگریزی بارکوں کے لئے جگہ صاف کرائی جن کی بد صورتی دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ فرید برلاس، جن صاحبوں نے اس خوفناک بربریت کا ارتکاب کیا تھا، انہیں اس بات کا مطلق خیال نہ آیا کہ دنیا کے شاہدار ترین محل کو غارت و تہہدم کرنے سے قبل اس کا کوئی نقشہ یا کیفیت ہی قلمبند کرا لیتے۔

قلعہ دہلی کی سرکاری عمارتوں میں بھی صرف چار یعنی نوبت خانہ، دیوان عام، دیوان خاص، اور رنات محل باقی رہ گئے ہیں۔ اس محل میں ایک عرصے سے گورہ فوج کا کھانا دانا ہونے لگا ہے۔ ان کے علاوہ دو ایک چھوٹی بارہ دریاں بھی اتفاق سے کبھی رہ گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قلعے کی منہلی زیب و زینت اپنی چار عمارتوں سے تھی لیکن ساتھ کے مکانات، دالان در دالان سلسلے اور چوک نہ رہنے سے یہ محض لائیں ہو کے رہ گئی ہیں اور ان کی آدھی خوبصورتی جاتی رہی ہے۔ اب بد صورت انگریزی بارکوں کے درمیان ہونے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی استاد

لے انصاف کا منتظلی ہے کہ اس بات کا بھی اقرار کیا جائے کہ ان چاروں شاہی عمارتوں پر انگریزی حکومت مرمت وغیرہ کے لئے بہت مقبول روپیہ خرچ کرتی رہی ہے۔

مشرقی جوہری کا زیور میں جڑا ہوا نگینہ، اپنی جگہ سے اکھاڑ کر محض کسی گھٹیا دیوار کے صندے میں لگا دیا ہے۔

## تان محل

اس شکستہ اور خراب کردہ قصر کو چھوڑ کر روضہ ممتاز محل کی طرف متوجہ ہونے سے خواہی غخواہی غوشی ہوتی ہے۔ اور لال قلعے سے بھی بڑھ کر غالباً یہی عمارت ہریشہ سے عہد شاہجہانی کا شاہکار بھی تھی۔ دوسرے اس کی خوش نصیبی تھی کہ انگریزوں کے اتفاقات کا مزع بن گئی اور وہ کچھ عرصہ سے اس کے متعلق کافی اہتمام کر رہے ہیں اور اسے باغ سمیت بالکل درست و بہتر حالت میں رکھتے ہیں۔

ہندوستان کی کسی عمارت کے اتنے نقشے اور تصویریں نہیں کھینچی ہونگی جتنی اس کی اور نہ کسی کی تفصیلی کیفیت اتنے بار قلم بند ہوئی ہوگی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود جن لوگوں نے اسے نہیں دیکھا، ان کے ذہن میں اس کا صحیح نقشہ اتر آنا قریب قریب غیر ممکن ہے جس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں انتہا درجے کی نازکی اور چابکدستی سے کام لیا گیا ہے، یا اس میں نہایت ہی نفیس و خوشنما مصالحہ لگایا ہے بلکہ یہ کہ اس کے نقشہ تعمیر میں کمال

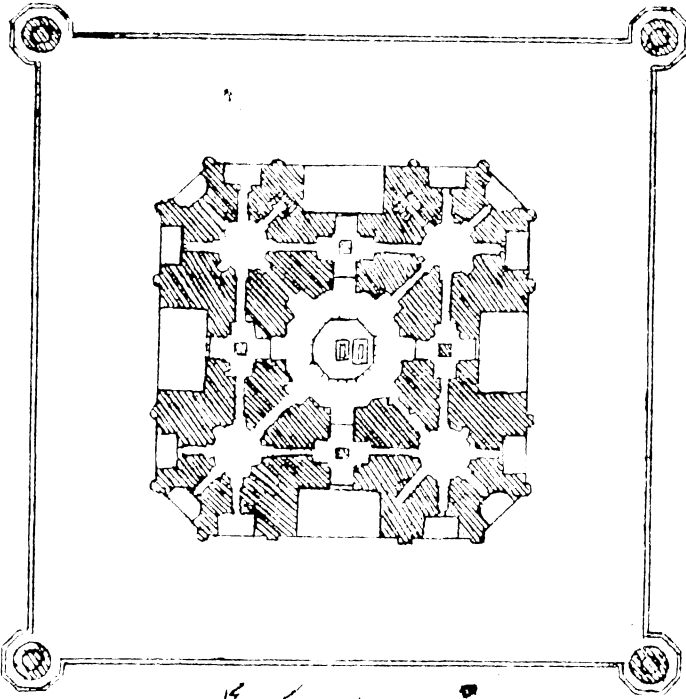
لے اس وحیانہ حرکت کا بنانا یا اندر یہ تھا کہ دہلی کی گورہ فوج کو، انہماکی حلقے یا بلوے سے محفوظ رکھنے کی غرض سے قلعے میں رکھنا ضروری ہوا۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو اسے جائز تسلیم کیا جاسکتا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ دہلی کی مقامی گورہ فوج کے لئے لال قلعے کے اندر اور یہ کم کرہ میں بہت کافی جگہ موجود تھی کہ شاہی عمارتوں کو توڑے چھوڑے بنیاد پر اسرار و سامان اور پرہیز کے سپاہی اندر رکھ سکیں اور باقی فوج کو واسطے باہر زیادہ کھلی جگہ میں بلند و روشن باکریں بنوائیں جہاں سے ناگہانی حملہ یا بغاوت کی صورت میں فوج بلا وقت قلعے کی پناہ لے سکتی تھی یا کم از کم ہوتا ہے انگریز انجینئروں نے خیال کیا کہ اگر محل کو گورہ فوج کی پناہ دیا جائے تو وہ یہ یاد دہری لٹھاے بنیزان کے بالک خانہ کا احاطہ تیار ہو جائیگا یا یہی قسم کی کوئی اور نجوسی کی شامت تھی جسکی خاطر محل کو ہندو کو گھٹیا

تو قلمونی اور ندرت صرف کی گئی ہے۔ اگر تاج محل صرف مقبرہ ہوتا تو بھی اس کی غلیحہ کیفیت بیان کرنے کے قابل ہوتی۔ لیکن لمبے لمبے میناروں کے ساتھ اس کا چوتراہ بجائے خود فن تعمیر کا ایک کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں پہلوؤں میں ایک طرف وہ مسجد ہے جو اور کہیں ہوتی تو بذات خود قابل ذکر عمارت سمجھی جاتی۔ عمارتوں کا یہ سلسلہ مقبرے کے باغ کے ایک ضلع پر پھیلا ہوا ہے اور یہ کل صحن باغ۔ ۴۰ فٹ مربع ہے۔ پھر ان عمارتوں کے دوسری جانب دوسرا صحن باغ، عرض میں اسی قدر لیکن کہ میں صرف نصف ہے۔ اس کے اندر جانے کے تین دروازے الگ نئے ہوئے ہیں اور اندرونی دیوار کے وسط میں صدر دروازہ اس شان کا بنایا ہے کہ پورے روضے کی زینت بڑھ گئی ہے۔ غرض یہ کہ ہر چند یہ مقبرہ بذات خود بہت خوبصورت عمارت ہے لیکن اگر تنہا ہوتا، تو اس کا آدھا حصہ بھی باقی نہ رہتا۔ اتنی خوبصورتیوں کا اس طرح جمع ہو جانا اور پھر ان کا ایک دوسرے سے کامل طور پر ملازم و وابستہ ہونا یہ اسباب میں جنہوں نے روضہ ممتاز محل کو مجموعی اعتبار سے وہ چیر بنادیا کہ دنیا اس کا شیل پیش کرنے سے عاجز رہے اور جس کی وجہ سے ان اشخاص پر بھی اس کا اثر پڑے بغیر نہیں رہتا جو عموماً حسن تعمیر کے تاثرات سے حد درجہ بے حس ہوتے ہیں۔

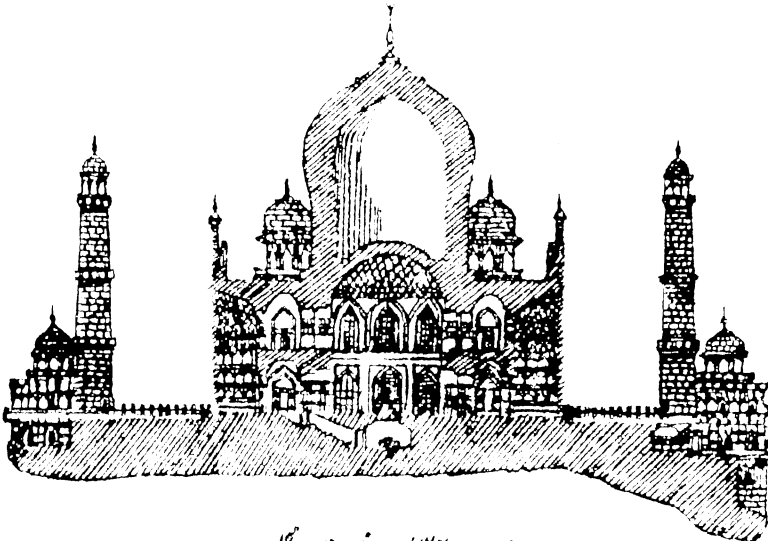
ذیل تھے خاکہ اور نقشے سے اس مجموعے کی صدر عمارت (یعنی مقبرے) کی ترتیب اور عمارتی خصوصیات کا صاف اندازہ ہو سکے گا۔ وہ چوتراہ جس پر عمارت قائم ہے زمین سے ۴ فٹ اونچا اٹھا ہوا ہے اس کے فرش پر اور سامنے سنگ مرمر کی چٹائی کی ہے اور ہر ضلع ٹھیک ۳۱۲ فٹ طویل ہے۔ چوتراہ کے ہر کونے پر ایک مینار بنایا ہے جس کا ارتفاع ۱۳۲ فٹ اور جملہ اجزا انتہائی حسن تناسب کا نمونہ ہیں اور شاید ہندوستان میں سب سے

اس باغ کا خاکہ تاج محل اور گرد کی عمارتوں کی شانہ ہی کے ساتھ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ جلد ہفتم صفحہ ۴۲ کو

خوبصورت مینار یہی ہیں۔ اس چوترے کے وسط میں مقبرے کی ۸۶ فیٹ



تصویر ۲۲۲۔ فاکر تاج محل



تصویر ۲۲۳۔ نقشہ تاج محل

مربع عمارت ہے جس کے گوشے بقدر ۲۳ فٹ ۱۹ انچ ترشے ہوئے ہیں۔ روکار کی طرف سے عمارت ۹۲ فٹ ۳ انچ اونچی ہے۔ وسط عمارت میں ۵۸ فٹ قطر کا بڑا گنبد چھت سے ۴، یا چوتھے سے ۹۱ فٹ بلند ہے۔ اسی کے نیچے سنگ مرمر کی جالی میں، جو ہندوستان کی نفاست و صنعت کی خاص مثال ہے، وسط میں ارحمند بانو سلیم یا ممتاز محل کی اور ایک طرف اس کے شوہر شاہجہاں کی قبر ہے لیکن جیسا کہ ہندوستان کے مقابلہ کا دستور ہے، یہ صرف تعویذ ہیں اور اصلی سید ہے سادے دفن زمین دوز حجروں میں ٹھیک تعویذ کے نیچے بنے ہوئے ہیں جیسا کہ اوپر کے نقشے میں دکھایا گیا ہے، عمارت کے ہر زاوے پر ایک دو منزلہ برج نما کمرہ ہے اس کا قطر ۲۶ فٹ ۸، اور جیسا کہ خاکے سے ظاہر ہے، یہاں سے مختلف غلام گردشوں اور ایوانوں میں راستہ جاتا ہے۔

دبلی کمرے میں روشنی صرف سنگ مرمر کی ڈھیری جالی کے ذریعے پہنچتی ہے جسے انتہائی کاریگری سے تراشا ہے۔ ان میں سے ایک جالی دیوار کے بیرونی رخ ہے اور ایک اندر جانب لگائی ہے۔ ہمارے (ہندوستان کے) ملک میں اس سے بالکل اندیشہ راہ جانے لگا۔ لیکن ہندوستان میں اور ایک ایسی عمارت میں جو سرتاپا سنگ مرمر سے بنی ہے سورج کی شعاع کو بدھ مگر کرنے کے لئے یہی صورت مناسب تھی ورنہ چمکا چوند سے بڑی حرمت ہوتی۔ بالکل اس وقت جو دہی دہی روشنی ہر طرف سے دور کی جالی کے ذریعے ایوان میں پہنچتی ہے اس سے مرکزی ایوان کی خیف تاریکی میں بھی کچھ عجیب دلکشی پیدا ہو گئی ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی جس زمانے

لے اس کی وضع دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ مہر شاہجہاں کے بعد لگایا گیا ہے۔ برصغیر نے اپنی کیفیت میں اس کا ذکر نہیں کیا اور یوں بھی اسے قریب زمانہ کہتا ہے جیسا کہ وہ فی الواقع معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ملکہ کے تعویذ کے گرد پہلے زر خالص کی مربع پوہر جالی اور اس میں دو چاندی کے دروازے تھے ان کی لاگت ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ بتائی جاتی ہے جب توہر محل کے جاثوں نے لاکھ لاکھ لاکھ کو لوٹا تو انہیں بھی لڑائے گئے اور گلا دلا کر

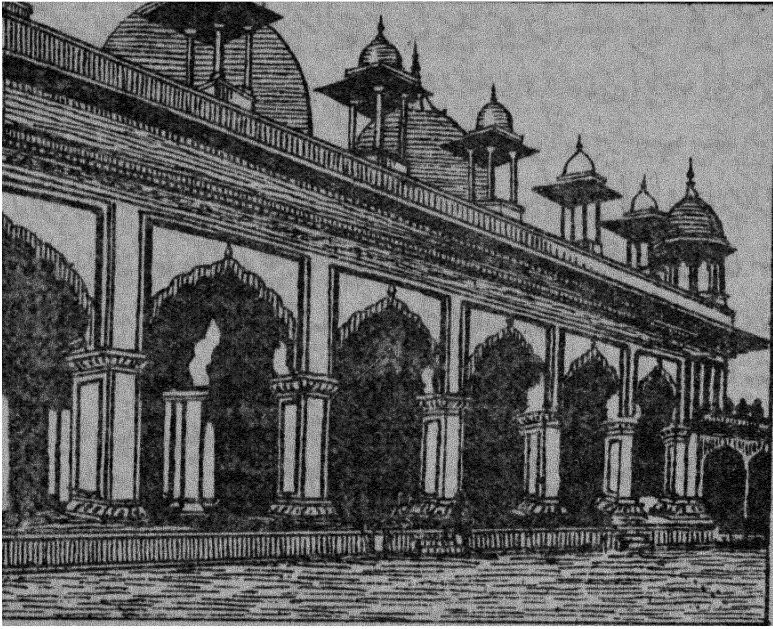
میں یہ تفریح کا مقام اور صرف باغ کی بارہ دری ہوگی، تو اس سے طبرہ کر  
 خوبصورت اور ٹھنڈی جگہ شاید کہیں نہ ہو، اور اب جو دفن کی وجہ سے  
 متحرم ہو گئی ہے تو دنیا کا سب سے شاندار و بڑا اثر مقبرہ ہے۔  
 یہ عمارت، جو اہرات کی نیگنہ کاری کا بھی جو اکبر کے بعد سے  
 سلاطین مغل کے طرز تعمیر کا ممتاز لازمہ ہو گئی تھی، بے مثل نمونہ پیش کرتی ہے  
 روضے کے ہر علاقہ (اسپینڈرل) میں گورنمنٹ اور جملہ ممتاز اجزا کا حسن،  
 لیش، سنگ ستارہ اور زبرجد وغیرہ قیمتی نیگنوں کی ترصیع سے دو بالا ہو گیا  
 ہے اور سنگ مرمر کی جس کے اندر وہ جڑے ہوئے ہیں، سفیدی ان کی  
 رنگینی کو اور بھی نمایاں کرتی اور مجموعی طور پر وہ جس دگر آں بہا طرز آرائش  
 بن گئی ہے کہ عمارت میں اس سے بہتر طرز کبھی اختیار نہ کیا گیا ہو گا۔ بے شبہ  
 اس کا یونانی آرائش کے حسن ذہنی سے تو مقابلہ ہو نہیں سکتا لیکن اسے  
 چھوڑ کر محض عمارت کی زیب و زینت کے لئے جو طریقے مروج ہوئے،  
 ان میں، یقیناً اسے فضیلت حاصل ہے۔ روضہ ممتاز محل کی قبروں اور  
 ان کے مجرمیں اس نیگنہ کاری سے بے دریغ کام لیا گیا ہے۔ اگر یہ  
 مغربی جانب کی مسجد، یا فواروں اور گرد کی دوسری عمارتوں میں ایسی  
 دریا ولی نہیں دکھائی۔ فی الواقع جس طرح یہ تزئین حیرت انگیز ہے،  
 اسی طرح مختلف حصوں میں جس تینرو ہویشاری کے ساتھ اس سے کام لیا،  
 وہ بھی کچھ کم عجیب نہیں ہے، اور اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد  
 کے ہندوستانی معمار کتنا اعلیٰ ذوق اور فن میں کس قدر سلیقہ رکھتے تھے۔  
 روضے میں سنگ مرمر کی روشیں بنائی ہیں اور ان کے کنارے  
 دور ویہ سرو کی قطاریں اور عقب میں سدابہار درختوں کی کثرت سے پوری

۱۷۱۔ اس عمارت سے بارہ دری یا تفریح گاہ کا کام کبھی نہیں لیا گیا۔ مترجم  
 Spandril) یعنی دو محرابوں کے درمیان (محبت تک کا) حصہ جسے غالباً رُکھی میں کوڑکی  
 بھی بولتے ہیں جیسہ راباد کے راج اسٹے علاقہ کہتے ہیں تو مترجم

عمارت میں ایسی عجیب کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ اس کا خود بانی روضہ یا اس کی اولاد تو مشکل سے اندازہ ہو گا۔ ان قطاروں کے وسط میں نہریں بنائی ہیں اور ان میں جا بہ جا فوارے نصب کر دیئے ہیں اور ہر قطار کے آخر میں جہاں چوک کھلتے ہیں، وہاں کوئی خوبصورت عمارت بنی ہوئی ہے۔ سامنے جہنا اور پیچھے یہ باغ، فوارے اور اس شان کا دروازہ، پھر اس کے مصالحوں کی خوبی اور شکل کا حسن یہ سب ایسے عناصر ہیں کہ دنیا بھر میں ایسی کسی عمارت کو بھی روضہ ممتاز محل کے مقابلے کے لئے ٹوک سکتے ہیں۔ ہر محل حسن اعلیٰ ترین قسم کا نہ ہو لیکن جس قسم کا ہے اس میں ایسا ہمسریں رکھتا ہوں۔ موتی مسجد، جسے شاہجہاں نے (۱۶۴۲ تا ۱۶۴۸ء) قلعہ آگرہ میں بنایا، گو اتنی شاندار نہیں نہ اتنی آراستہ پر آستہ ہے جتنی اس بادشاہ کی دوسری عمارتیں، تاہم دنیا کی نفیس ترین مساجد میں اس کا شمار ہے۔ یہ آثار سمیت صرف ۱۸ × ۲۴ فٹ ہے یعنی کچھ بہت وسیع نہیں اور بلند چوڑے پر ہونے کے باوجود باہر سے حسن تعمیر کا کوئی ادعا نہیں رکھتی۔ لیکن ادھر مشرقی دروازے سے مسجد میں قدم رکھا اور ادھر صحن کی خوشنالی نظروں میں کھلب گئی۔ پوری عمارت بے جرم سنگ مرمر کی اور جملہ اوضاع و اشکال بنایت نفیس ترین ہیں۔ اسباب تزیین میں صرف ایک کتبہ ایسا ہے جسے اصطلاحاً عمارتی چیز نہیں کہہ سکتے۔ یہ خود مسجد کے حاشیے میں سنگ موسیٰ کے حروف جڑ کر مرتب کیا ہے۔ صحن مسجد ۱۵ × ۱۵ فٹ یعنی قریب قریب مربع ہے۔ اس کے تین طرف دس دس فٹ چوڑے اور نیچے نیچے والاں بنے ہوئے ہیں۔ گر مغرب کی طرف مسجد کی اصل عمارت اندر سے ۱۵ × ۵۶ فٹ ہے اور دونوں سروں پر شاہی محل سرا سے اس میں راستہ آتا ہے۔ صحن مسجد کی طرف اس کی سات کمانیں نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہیں اور چھت پر تین گیند شعلی وضع ہیں، جو ان دونوں ہر جگہ مروج ہو گئے تھے۔ ذیل میں جو تصویر ہم نے دی ہے، وہ اس عمارت کا پورا حق ادا نہیں کرتی اور اس کی پوری



قدر جانتی ہو تو برائے لعین دیکھنا ضروری ہے۔ بہر حال میں تو شکل سے کوئی دوسری عمارت جانتا ہوں جو اتنی



تصویر ۲۲۶

صاف سُتھری اور نفیس ہو یا وضع میں اکبری عمارات سے جو اسی جگہ بنی ہوئی ہیں، اس قدر حیرت انگیز فرق رکھتی ہوئی کہ دہلی کی جامع مسجد ۱۵۶۵ء میں بنی شروع ہوئی مگر مسئلہ سے پہلے تکمیل کو نہ پہنچی تھی اس کا نقشہ موتی مسجد کے نقشے سے مشابہ ہے اگرچہ پیمانہ کہیں بڑا رکھا ہے اور دو مینار بھی اضافہ کئے ہیں جو آگرے کے نمونے میں موجود نہ تھے۔ اسی کے ساتھ سنگ مرمر میں سنگ سُرخ کی آمیزش نے وہ نفاست و پاکیزگی یہاں نہیں رہنے دی جو موتی مسجد کا وصف ہے۔ بایں ہمہ یہ ہند یا بیرون ہند کی ان مسجدوں میں ہے جن کا منشا ہی باہر سے دلکش اثر ڈالنا ہے۔ اسے بہت ہی بلند کرسی پر تعمیر کیا ہے۔ تین

بڑے دروازے ہیں گوشوں پر چار برج اور صدر والان پر عالیشان گنبد بنائے ہیں اور یہ سب نہایت خوبی سے ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور اسی کے ساتھ الگ الگ وضع کے اجزائے عمارت ہیں جن سے پوری مسجد میں عجب حسن اور شان تنوع پیدا ہو گئی ہے مسجد کا طول ۲۰۱ اور عرض ۲۰ فیٹ ہے۔ سامنے دو تون کوٹوں پر ایک ایک منار ۳۰ فیٹ بلند بنا ہوا ہے۔ اس میں عمودی پٹیاں اس ترتیب سے ڈالی ہیں کہ ایک سنگ مرمر کی ہے دوسری سنگ سُرخ کی اور اوپر دروازے برجیاں بنادی ہیں۔ اس کا صدر یا بادشاہی دروازہ فتحپور سیکری کے دروازے کے مقابلے کا تو نہیں مگر بڑی شان و خوبی کا دروازہ ہے اور چھوٹے پیمانے پر سوئچی وجہ سے یہ اپنی اشیائے گردش سے زیادہ مناسب رکھنا ہے۔ یہ بات تعجب سے خانی نہیں ہے کہ شاہجہاں نے اپنے قلعہ دہلی میں کوئی مسجد نہیں تعمیر کی حالانکہ اکبر نے فتحپور کے محل میں مسجد بنائی اور خود شاہجہاں نے اہمرے کے محل کی موتی مسجد سے زینت بڑھائی۔ لال قلعے میں جو چھوٹی موتی مسجد بنی ہوئی ہے یہ اور نگریب کی ایذا دہ ہے اور اگرچہ بطور خود بہت خوبصورت ہے تاہم بہت ہی چھوٹی یعنی ۱۰۰ فیٹ مربع اور اس قلعے کی شان کے لائق نہیں ہے۔ غرض خود شاہجہاں نے قلعے کے اندر کوئی عبادت گاہ نہیں بنائی اور نہ ظاہر اس کا قصد کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کمی کو اس واسطے جائز رکھا گیا کہ خود جامع مسجد قلعے سے قریب اور بظاہر ایک ہی وسیع منصوبے کا جزو تھی۔ ایک مسجد بازار کے وسط میں، قلعے کے دہلی دروازے کے سامنے ۱۱ فیٹ اونچے چوڑے پر بنی ہوئی ہے مسجد میں داخل ہونے کے لئے شمال و جنوب کی طرف زینے ہیں لیکن سامنے کا

لے بظاہر متن کی عبارت میں کچھ لفظ سہواً چھوٹ گئے ہیں اور آگے کے بیان سے بھی صاف نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس مسجد کا ذکر ہے؟ مترجم

صدر دروازہ غدر کے زمانے میں انگریزوں نے منہدم کر ڈالا تھا۔ اس کا رقبہ کچھ زیادہ نہیں صرف ۱۲۰ x ۱۰۰ فٹ ہے اور اس میں پانچ درہیں۔ اس کے تین گنبد بلاگردنے کے بنائے ہیں اور یہ گویا قدیم صیٹی اور بعد کی صراحی دار وضع کے بین بین صورت نکاتی سے ان کی چٹائی سنگ سرخ سے کی گئی ہے لیکن دور میں سنگ مرمر کی ٹکڑی کی دھاریاں ہیں جو خوشنمای سے خالی نہیں اور عمارت سے بھی فی الجملہ مناسبت رکھتی ہیں۔ یہ مسجد ۱۶۴۲ء تا ۱۶۴۴ء میں شاہجہاں کی شائستہ و عالی بنار بیٹی جہاں آرا بیگم نے بنائی یا اس کے نام پر بنائی گئی تھی۔

## اورنگ زیب عالمگیر - ۱۶۵۸ء تا ۱۶۷۰ء

فن تعمیر کی تاریخ میں ابھی حیرت انگیز چیزیں بھی کم ہوں گی، جیسا کہ اورنگ زیب کی سخت نشینی کے ساتھ ہی ذوق عمارت میں رخصطایا کا نمایاں ہونا ہے۔ اس کے عہد میں سلطنت مغلیہ اتھائے عروج کو پہنچ گئی تھی اور کم سے کم ظاہر میں تو اس کے اخیر زمانہ تک کوئی ضعف یا کمزوری نظر نہ آتی تھی۔ مانا کہ اس کی زار و باز مرودہ دلی اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ محلات اور سرکاری مکانات پر ملک کا بہت سارو پیہ خرچ کیا جائے، تاہم خیال ہوتا ہے کہ اس کی مذہبی وادخلی نے اسے یہ ترغیب تو دلائی ہوگی کہ مساجد یا اور دینی آثار اس شان و شوکت کے تیار کر جائے جو اسلاف کی بادگاروں سے بڑھے چڑھے ہوں۔ لیکن واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس نے بشیشور کے مندر بنارس کو تڑوایا کہ وہ شاہی مسجد تعمیر کرائے، جس کے بلند و خوشنما مینار آج بھی شہر کے منظر کی سب سے نمایاں علامات میں داخل ہیں۔ پھر جہانگیر کے زمانہ میں برنگہ بندیل نے کیشو دیو یا کرشن کا جو مندر رستھل میں بنایا یا از سر نو تعمیر کرایا تھا، اور نہایت مقدس مانا جاتا تھا

اسے بھی ”شاہ دیں پناہ“ نے ۱۶۶۹ء میں زمین کے برابر کرادیا اور اس چوڑے پر ایک وسیع مسجد بنانے کا حکم صادر کیا گیا۔  
لیکن یہ کام شوق تعمیر کی وجہ سے نہ تھے بلکہ اس مسجد سازی کا فضا محض منہ در عیا کو ذلیل کرنا اور اسلام کے غلبے کا ثبوت دینا تھا۔  
بایں ہمہ یہ مسجدیں بھی کوئی خاص شان و شوکت نہیں رکھتیں اور ان دو کے سوا جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف ایک بڑی مسجد اس عہد میں (لاہور میں) اور تعمیر ہوئی تھی۔

یہ آخری مسجد جسے لاہور کی جامع مسجد یا بادشاہی مسجد کہتے ہیں، دار الشکوہ کی ضبط کردہ جاگیر کے روپے سے ۱۶۷۹ء میں بنوائی گئی اور حضور نبی باغ کے منسوب سے اس میں داخل ہوتے ہیں۔ خود حضور نبی باغ کا دروازہ جو محراب دار چوتھے پر اٹھایا اور سنگ مرمر سے بنایا ہے، بڑی شان کی تعمیر ہے۔ اس کے بتلی دالانوں پر جو حجرہ ہے اس میں حضرت رسول کریم صلعم اور آپ کے اہل بیت کے بعض ”تبرکات“ محفوظ ہیں، مسجد کی تعمیر بادشاہ شہرے رضاعی بھائی خدا سی خاں کو کا کی نگرانی میں ہوئی اور یہ کافی حسن و خوبی کی عمارت اور منلیہ طرز کی آخری یادگار ہے۔ اس میں سنگ مرمر کے اور بہت دلفریب شکل کے تین گنبد ہیں اور نہ صرف اس معاملے میں بلکہ روکار کی عظام ترتیب و ترکیب میں یہ قریب قریب جامع مسجد دہلی کا غنئی ہے لیکن وسطی محراب کی سنگ مرمر کی تزئین اور صدر دالان کی سامنے کے رخ کی نقاشی بہت ادنیٰ درجے کی ہے دوسرے کونے کے مینار روکار کا سرا ہونے کی بجائے بالکل جداگانہ اور سیدھے سادے نمٹن جرج کی صورت میں بنادیئے ہیں جب منمؤل یہ تین درجے کے تھے لیکن مسئلہ کے زلزلے سے انہیں صدمہ

۱۔ فاضل صنف نے عام انگریز یا نج نویسوں کی طرح ان تفصیل کو بہت کچھ جاننے اور نادانانہ تعصب کے رنگ میں لکھ دیا ہے اور ان احکام کی کوئی وجہ لکھنے کی تکلیف نہیں اٹھائی نہ یہ لکھا کہ اگر بادشاہ کی حکمت عملی ہی یہ تھی تو اور ہزاروں مندر کیوں چھوڑ دئے گئے؟ مترجم

پہنچا تو اوپر کی برجیاں اتر وادی گئیں۔ یہ صحن مسجد کے انتہائی گوشوں پر ایک دوسرے سے ۷۵ اگڑ فاصلے سے واقع ہیں۔

ذوق تعمیر میں حقیقی سرعت سے زوال آیا، اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ سلسلہ دستہ کے درمیان جب کہ یہ بادشاہ اورنگ آباد میں مقیم تھا، اس کی سب سے عزیز ہومی رابعہ دہرائی بکمر کا انتقال ہوا اور اس کے لئے ہو بہ ہو روضہ ممتاز محل کے نمونے پر مقبرہ بنائے گئے تجویز ہوئی۔ یہ تعمیر بادشاہ کے تیسرے بیٹے اعظم شاہ سے منسوب ہے لیکن ان دونوں عمارتوں کو دیکھ کر جو چند ہی سال کے فاصلے سے بنی ہیں آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ایک تو وہ عمارت ہے کہ بعض خصوصیات میں انہیں ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے، دینا بھر میں اس کا نظیر نہیں اور ایک یہ اورنگ آباد کا مقبرہ ہے کہ کوئی خاص نفاست یا نقشے کی خوبی نہیں رکھتا اور بد ذوق اور مجید بے پن کا نمونہ بن جانے سے بال بال ہی بچ گیا ہے۔ تاج کی ایک اور نمونہ نقل انیسویں صدی کے آغاز میں لکھنؤ کی کتنی تھی اور وہاں کے ایک بادشاہ کا مقبرہ بالکل اسی نمونے کا تعمیر ہوا تھا مگر یہ نمونہ سر سے بادوں تک بد مذاقی اور بھدے پن کی تصویر ہے اور حقیقت میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کوئی شے صورت میں اس قدر یکساں اور مصنوعی اعتبار سے اس درجہ مغائر کیوں کر ہو سکتی ہے مگر واقعہ یہی ہے اور یہ تین تاج بہترین مقیاس میں جن سے مغلیہ سلطنت کے عروج اور پھر سرست تنزل کے وقت فن کے انحطاط کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

خود اورنگ زیب کی قبر غار ہائے آورا کے قریب قریب اوپر موضع خلد آباد کے مقبرہ، شیخ زین الدین ۷ میں بنی۔ یہ جگہ تو مسندس سمجھی جاتی ہے لیکن مقبرہ بہت کھٹیا اور ایسا ہی معمولی ہے جتنا کسی

۱۷ اورنگ زیب کی شادی اس ملکہ سے جس کا اصلی نام درکس بانو بنت شامو (زماں مصنوعی) تھا ۱۷۱۲ء میں ہوئی اور اس سے بادشاہ کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔

بادشاہی امیر کے لئے موزوں ہوتا۔ بظاہر عالمگیر نے تاتاری شان و شوکت کا یہ لازمہ پیہم پہنچانے کی پروا نہ کی اور اس کے جانشینوں نے چاہا بھی ہو تو اتنے مشق و زہد تھے کہ اس کمی کو پورا کر دیتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ منہ و وول کے تلسی کے مقدس پیڑ نے اینٹ کے فرش میں ایک بار جڑ بکھری اور بڑا کمر خوب تناد رہ گیا اور اس طرح گویا اس شخص کی تحقیر کرتا تھا جس سے بڑا کمر منسوب نظام سے منہ و وول کو کبھی سابقہ نہ بڑا تھا بلکہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، اور انک زب نے قلعہ دہلی میں بھی بعض اضافے کئے اور اس کے عہد میں پائے تخت کے اندر اور دوسرے مقامات میں بہت سے عالیشان محل (اور لوگوں کے) تعمیر ہوئے۔ ان میں سب سے وسیع و بڑا شکوہ اس کے ناکام حریف بھائی داراشکوہ کا محل تھا لیکن اس کی انگریزی رزیڈنسی بنایا گیا اور چند ہی سال میں صد لے اور سفیدی سے اس کی کجی کی وہ وہ قہلاہیں کئی تھیں کہ یہ پتہ چلانے کے لئے کہ یہ کلیتہً ایک کلو سکن قوم کا تعمیر کردہ نہ تھا، کافی ذہانت درکار ہے کہ خاص شہر میں عالمگیری زمانے کی بہت سی حوٹیاں اور محلات اس سنجاست سے مدتوں تک محفوظ رہے لیکن اب عموماً وہ کھنڈر ہو گئے ہیں، یا دکانوں کے کام آتے ہیں۔ ان میں شان و کھل موجود ہے مگر طرز تعمیر میں جو زوال رونما ہو گیا تھا، اس کی بھی صاف صاف علامتیں نظر آتی ہیں اور یہ زوال آدھ و حیدر آباد کے جدید صدر مقامات یا دوسرے شہروں میں جو گزشتہ صدی کے اندر مشہور ہوئے اور بھی زیادہ صریح ہے۔ گمران شہروں میں بھی وسیع و رفیع الشان عمارتیں ایسی موجود ہیں جو اپنی وسعت و بولبولی کی بناء پر لائق توجہ ہیں اور ایسی سمجھ کے لئے جو صرف انحراف کے چوڑے گچ کے عجائبات دیکھ کر سہمی ہو، ان میں حسن و دلکشی

لے ناضل مولف نے ان چند جملوں میں جو منظر بانڈ کیا ہے اس سے ثابت ہوا ہے کہ خود کھنے و ملا تھب کی رو میں کتنی دور برگیا ہے ؟ مترجم

کے بہت سے اسباب مہیا ہیں لیکن سنگ مرمر یا پتھر کے چوکون کی بنائی ان میں بہت کم ہے اور زیادہ ٹرائینٹ یا انکھٹر (یا ٹوٹے پتھر) سے بنائی گئی ہیں اور سچ کے نقش و نگار بنائے ہیں جو آگرہ و دہلی کی حیرت انگیز صناعیوں کے پہلو پہ پہلو ہو چکی وجہ سے کبھی تحسین و ستائش کے مستحق نہ ہو سکیں گے۔

ہندوستان میں اسلامی فن تعمیر کی تاریخ، جسے جامعیت کا ذرا بھی دعویٰ ہو مکمل نہیں ہو سکتی جب تک شاہی عمارتوں کے علاوہ دوسری اہمیت خاص کر مقابر کی کیفیت نہ بیان کی جائے جو ملک کے گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ دہلی و آگرہ ہی میں بادشاہی مقبروں کے علاوہ جن کا اوپر تذکرہ ہوا، صدہا درباری امرا کے مقبرے ایسے ہیں کہ رفعت و سلطنت میں اپنے آقاؤں کے مقبروں سے بہ مشکل کم ہونگے۔

صدر مقامات سے قطع نظر، گنگا جمن کی وادی میں، بلکہ مشرق میں ڈھاکے تک شاید ہی کوئی باوقعت بستی ایسی ہوگی جس میں تعمیری شان و شوکت کی اس صنف (یعنی مقابر) کے دو چار نمونے موجود نہ ہوں۔ جو پورہ والہ آباد میں خصوصاً کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں لیکن چٹنے اور ڈھاکے میں چھوٹی قسم کے مقبروں کی دو دلکش ترین مثالیں ایسی موجود ہیں کہ ان سے بہتر کہیں نظر نہیں آئیں۔

## میسور و اودھ

ان دو ملکوں کے طرز تعمیر پر دو ایک باب سیاہ کر دینا کچھ مشکل نہیں مگر اسے دلنشین کرنے کی غرض سے چند تصاویر بہر حال کندہ کرانی پڑیں اور یہ مضمون آنا ضروری نہ معلوم ہوا کہ اس کے لئے یہ زحمت برداشت کی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا دونوں ملکوں میں، میسور کی اسلامی حکومت صرف چالیس برس (۱۷۹۹ء تا ۱۸۵۷ء) رہی تاہم چونکہ وہ فرنگی اثرات سے کافی دور تھی

اس لیے ایک ایسا طراز اختیار کئے رہی جس میں صحیح معنی میں بعض خصوصیات  
موجود ہیں۔ جس طرح ٹیم کی حویلی جو دریا دولت موسوم ہے طرز میں دو گاہ  
کے محل سے ملتی جلتی ہے جو قریب قریب اسی زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔  
لیکن اس حویلی میں وہ شان و قوت نہیں اور نہ تزئین و آرائش میں دو گاہ کے  
محل سے کوئی مقابلہ کر سکتی ہے۔ مگر باقی خاندان (حیدر علی) کا مقبرہ اور  
اس پاس کے کنبہوں میں بھی عظمت رفتہ کی یادگار پائی جاتی ہے مگر  
یہ دہلی و آگرہ کے شاہی مقبروں کے ہانگ بھی نہیں ہیں۔

دوسری طرف دوسرے نواب و وزیر اور دہلی، ابوالمنصور خاں صفحہ جنگ  
(۱۷۳۹ء تا ۱۷۸۵ء) کے مقبرے کو لیجئے جو دہلی و قطب صاحب کے درمیان  
بنا ہوا ہے تو یہ اس مقام کی شاہی عمارتوں میں کچھ بدتریب نہیں معلوم ہوتا  
حالانکہ یہ بہت بعد کی (۱۷۸۵ء کی) عمارت ہے۔ دور سے یہ نہایت  
شاندار و پر شکوہ نظر آتا ہے۔ اگر یہ قریب سے معائنہ کرنے پر مجبور ہوں  
ہے۔ اسے ایک وسیع باغ میں محرابی حجروں کی کرسی دے گئے (جو دس فٹ  
کنبہ اور ۱۰ افٹ مربع ہے) بنایا ہے عرض و طول ۶۰، ۶۰ فٹ کے قریب  
اور نقشے کی عام وضع قطع جہازوں کے شبرے سے فی الجملہ مشابہت رکھتی ہے  
دسلی کمرہ ۲۰ فٹ مربع اور اس کے اندر سنگ مرمر کا بہت خوبصورت  
تعمید ہے۔ پتھر کی خوب جلا کی ہے مگر ساخت میں قدرے تصنع پایا جاتا ہے۔  
فرشیں اور دیواروں کے نیچے حصے میں سنگ مرمر دکھایا ہے اور چائیس  
فیٹ کی بلندی پر ایک صفا کنبہ تعمیر کیا ہے۔ دسلی کمرے کے گرد چار  
مربع اور چار آئینہ منجرے بنائے اور ایسے ہی اوپر کی منزل میں بنے ہوئے ہیں۔  
مجموعی عمارت کی نسبت تو ابھی پلاسٹ اینڈ برنزٹ کے مصنف (منٹرفشا)  
کی رائے ہے کہ کوئے کے برجوں کی سجاوٹ کامیاب نہ ہو تو بھی بیچ  
میں ملے رنگ کے سنگ سرخ اور سنگ مرمر کا اجتماع نظر قریب سے مگر  
اندرونی سے جو نقش و نگار بنائے ہیں، دوسرے میں غائباب سے  
ذیل خیر ہے۔ لیکن اس کے خاندان والوں نے آخر میں جس شہر کو اپنا



صدر مقام بنالیا تھا، وہاں تو وہ ایسی بھی کوئی عمارت نہ بنا سکے جس کی اتنی مشروط تکلیف ہی کی جاسکتی اور نقش و نگار کی افراطی سے فن کی ضرورت پوری ہو جایا کرتیں تو ہندوستان کا کوئی بڑا شہر اس کے اتنے نمونے نہ پیش کر سکتا تھا جتنے لکھنؤ میں جمع ہیں حقیقت میں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس خاندان نے اپنی صرف ایک صدی کی زندگی میں اپنے صد ہا عمارتوں کو اتنی بھر پوری عمارت سے کس طرح معمور کر دیا جو سب کی سب، یا شاید وادہ استثنیات کو چھوڑ کر باقی تمام، بدترین ذوق کا ثبوت دیتی ہیں۔ یورپ میں فن تعمیر کی نشاۃ جدیدہ کے متعلق جب کہ سولہویں صدی میں قدیم طرز کو دوبارہ فروغ ہوا، جو کچھ بھی کہا جائے، ہندوستان میں تو یہ حد درجہ آہستہ ثابت ہوا۔ قدیم ستون گرمی کے طریقے جس لائینی گنوارپن سے یہاں ایک ایسی قوم نے استعمال کئے ہیں جو خود اپنے طرزوں میں وہ وہ اعلیٰ درجے کے گمنوں نے تیار کر سکتی تھی، وہ فن تعمیر کی تاریخ میں سخت حیرت انگیز حادثہ ہے۔

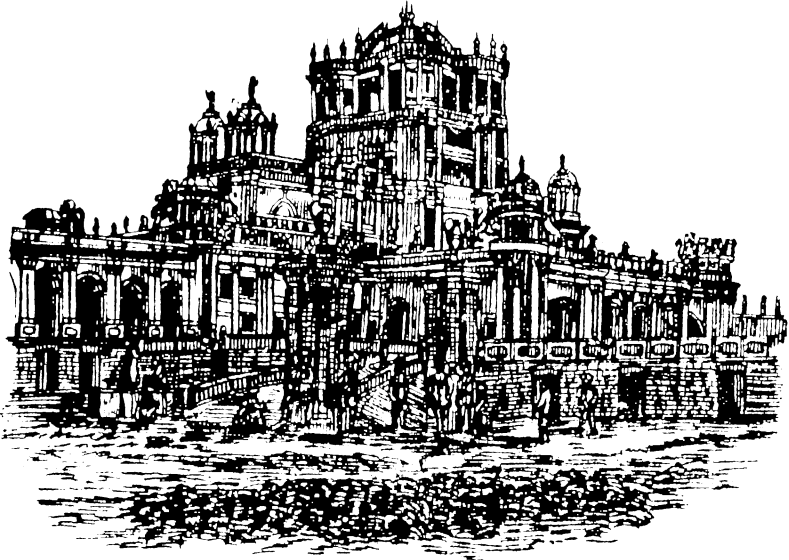
اطالوی طرز کی جو عمارتیں لکھنؤ میں بنیں ان میں سب سے قدیم اور مشہور، بنیہ میں ایک ”کونستنس شیم“ کی عمارت ہے جسے جنرل کلاڈ مارٹن نے اپنے رہنے کے واسطے بنایا تھا مگر وہ اس کی وفات کے بعد تکمیل کو پہنچ سکی نہ ہو۔

۱۷ “Mansion of Constantia” ایک وجہ یہ غالباً تھی کہ جنرل موصوف نے “Labore et Constantia” (محنت و استقامت) کو اپنی توقع بنالیا تھا اور مکان کی ردکار بھی یہی الفاظ لکھوائے تھے۔ ۱۸ جنرل مارٹن، یونان (فرانس) میں سلاطین میں پیدا ہوا اور لکھنؤ میں سلاطین کی وفات پائی۔ وہ فرانسیسی فوج میں معمولی سپاہی بھرتی ہوا تھا مگر لالی کی سخت گیری سے نوکری چھوڑ کر بھاگا اور مان دہی چہری کے محاصرے کے زمانے میں انگریزوں سے آلا جہاں اسے کھانا کے عہدے تک ترقی ملی۔ ۱۹ اس نے نواب آدھ کی ملازمت میں شمول کر دیا اور وہیں سلاطین میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی اس نے

مسلم ہوتا ہے کہ یہ جبرل اپنا مہار بھی آپ ہی تھا اور اسی لئے جو نمونہ تیار کر گیا ہے وہ ترتیب کے اعتبار سے عجیب مبہون مرکب سا، اور ضوابط فن (طرز پلا دیو) جسے لحاظ سے ایسی سنگین غلطیوں کا مجموعہ ہے جو کسی طرح معاف نہیں کی جاسکتیں البتہ ایسے موسم اور ان خاص حالات کی بنا پر جن سے بانی کو یہاں سابقہ تھا، نظر انداز کرنے کے لائق ہیں مگر ان اسقام کے باوجود درجہ بدرجہ چھتوں کے اوپر جو بڑا مرکزی برج بنایا ہے، اس میں کچھ نہ کچھ بات عجیب اور قابل دید ضرور ہے اور ان چھتوں کے نیچے فراخ ایوانات کا جو سلسلہ تیار کیا ہے، اس کی اندرونی ترتیب بہت ہی خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف موسم کے اعتبار سے بھی نہایت ہی موزوں ہے۔ خط افقی کو جا بہ جا برجیاں بنا کر توڑ دیا ہے جو بہترین ذوق کی دلیل نہیں تو ہوں، اپنی جگہ پر خوشنما فی ضرور کھتی ہیں اور ایسے شہر کی نواح میں موزوں بھی ہیں جہاں اس قسم کی آرائشی چیزوں کی اتنی افراط ہے جتنی لکھنویں۔ بغرض مجموعی طور پر دیکھئے تو یہ عمارت فونٹل میں بہت فوریہ کے عجیب نمونے سے جو اس کی حریف ہے زیادہ مقبولیت رکھتی ہے اور اگر اس کی جزئیات زیادہ خالص ہوتیں اور وہ بیہودگیوں نہ کی جاتیں جو ایک انارمی لامحالہ کیا کرتا ہے تو وہ قطعاً یہ ہے کہ اس میں ایک نہایت دلکش تعمیر کا نقش اول موجود ہے۔

تصویر چھوٹی دیگر

بقیہ حاشیہ نمبر گزشتہ۔ نہایت مقبول امانتہ اور کثیر سرمایہ چھوڑا جس کا ایک حصہ لیون کلکٹ اور لکھنویں مدرس قائم کر کے لئے تھا اگر وصیت نامہ بہت طویل اور خود اپنی قلم سے ایسی بڑی بگڑی میں لکھا تھا کہ اس روپے کا بڑا حصہ عدالت ہی کی نذر ہو گیا۔



تصویر نمبر (۲۳۸)

بڑے برج کے سب سے نیچے ایک دھندلے لداؤ کے حجرے میں بانی مکان  
دفن ہوا۔ اس کی قبر کا سیدھا سادہ تقوید قرش پر بنا ہوا ہے اور اس کے ہر گوشے پر  
گولنداز سپاہی (کی سورت) پروری و روی پہنے، بحالت عم ہتھیا رنگول کئے، گویا اپنے  
آقا کے خاتمے پر ماتم کناں ایستادہ ہے۔ یہ تقوید اور موتیں بھی یہاں کے قبر و رسی  
چیز کی طرح بری بنی ہوئی ہیں۔ لیکن ایک سپاہی کی قبر کے لئے ایسی یادگار بنانے کا  
تخیل یقیناً بہت ہی سوزوں اور دلکش ہے۔

یہ عمارت جب نئی نئی بنی تو لازماً حیرت انگیز تھی۔ کم سے کم اودھ کے بادشاہوں پر تو اس کا  
بہت ہی اثر پڑا اور گوانچی مسجدیں، مقبرے اور اماں سارے تو اسی جگہ سے ہوئے اسلامی طرز میں جن ان دنوں مروج

لے نصف اللہ دہلے نے خواہش کی تھی کہ سو لاکھ (= ایک کروڑ) روپے میں اس مکان کو خرید لیا جائے۔ مگر  
مارٹن ڈراکھ مرنے کے بعد دہلی عدالت والے اس کی ضبطی کا حکم نہ دے دیں اور اسی سے بچانے کے لئے  
اپنی قبر یہاں بنوائی۔ غدر کے زمانے میں بلوایوں نے اس عمارت پر قبضہ کیا اور اس کی قبر کو دگر ڈیاں  
باہر پھینک دی گئیں مگر ۱۸۶۵ء میں پھر قبر بنوائی گئی۔

تھا تیرموتدہ لیکن ان کے سوا لکھنؤ میں جس قدر عمارات بنے وہ آمیندہ  
 اسی اطالوی نما طرز میں تھے۔ فرحت بخش، سعادت علی خاں نے، چھتر منزل  
 نصیر الدین حیدر نے بنوائی اور اسی طرح بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں  
 ایک طرف تو فرانس اول کے عہد کی عجیب و غریب بے قاعدگی نظر آتی ہے  
 اور دوسری طرف ہنرمندی چہارم کی عمارت سے بھی زیادہ انوکھے نقش و نگار  
 موجود ہیں۔ مگر ان سب سے بڑھ چڑھ کر ان میل بے دہشتی قیصر باغ کی عمارت  
 ہے جسے واجد علی شاہ نے تیار کرایا تھا۔ یہ ایک نہایت وسیع صحن کے  
 چار طرف عمارات کا سلسلہ ہے اور نیولین ٹالٹ کے قصر لورے اور  
 تیریز کو ملا دینے سے جو صورت نکل آئی تھی، اس سے دست و ترب میں  
 کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتا ہے لیکن پیس کے نفیس چھتر کی بجائے یہاں اینٹ  
 چونا اور اس فرنگی محل کے موزوں اجڑا کی بجائے یہ قریب قریب ساری دو منزل  
 عمارت نئی ہی دھنوں کا مجموعہ ہے۔ عام طور پر دونوں منزلوں میں صندوقی  
 اور بہت ہی حقیر صورتوں کے ستون چلے آگئے ہیں اور درمیان میں یکے بعد دیگر  
 اطالوی دیکچے (جن کے پٹ ونسی وضع کے ہیں) اور اسلامی محرابیں انحص  
 کھلے ہوئے در بلاسی ترتیب کے آجاتے ہیں۔ ان کے اوپر کنگورے اسلامی  
 طرز کے اوپر جہاں ایسے نمونے کی بنائی ہیں کہ روم و اطالیہ میں کسی نے کبھی  
 دیکھی بھی نہ ہوئیگی۔ پھر ان سب کو ایسے رنگوں سے رنگ دیا ہے جو جتنے  
 شوخ ہیں اسی قدر گنوار بھی ہیں۔ اندر کئی وسیع و خوشنما ایوان ہیں مگر سب سے  
 وہی بد مذاقی ظاہر ہوتی ہے جیسی بیرونی عمارت سے ہو

البتہ بگم کوٹھی جو قیصر باغ کے سلسلے کی دوسری عمارتوں سے الگ  
 بنی ہوئی ہے غالباً ان سب کی نسبت اس طرز کا بہتر نمونہ ہے اگرچہ نہیں  
 کہہ سکتے کہ یہ اطالوی فن کا کوئی اچھا نمونہ پیش کرتی ہے یا اس طرز میں مشرقی  
 ضروریات کے مطابق تصرف کی کوئی عمدہ مثال ہے۔ لیکن اس میں ایک  
 خاص قسم کی بولمونی پائی جاتی ہے جس نے کسی حد تک اس کے دوسرے  
 عیوب کی تلافی کر دی، مصل یہ ہے کہ اطالوی طرز تعمیر کے سبھی مشرقی نمونے

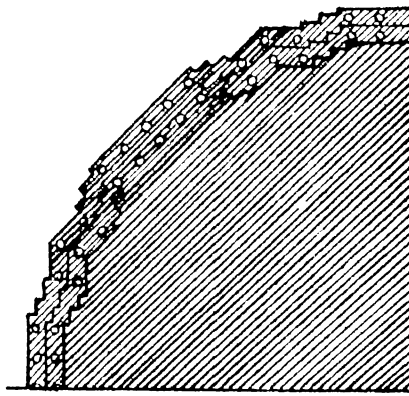
قدیم ستون اور گردنے کی صحیح تقسیم کے اصول کے خلاف ددزی کرتے ہیں اور دوسروں کی نسبت کم سہی، سنگم کو بھی میں بھی یہ خرابی موجود ہے۔ حقیقت میں ہندوستان کا کوئی باشندہ ہماری (فرنگی) تقسیم کی اصل و بنا کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ گردنے کو لکھنی، حاشیہ، سرستون کے مستقل اجزائیں کیوں تقسیم کیا جائے، کھمبوں کی لمبندی میں خاص خاص قطروں کی پابندی کیوں کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ سچ پوچھئے تو یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی شخص زبان کو جانے بغیر اس کی تحریر کو نقل کرنے کی کوشش کرے حالانکہ اس کی الف بے تے بھی نہیں جانتا۔ ظاہر ہے کہ لکھنی ہی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کرے، اس کام کو وہ صحت کے ساتھ کبھی انجام نہ دے سیکے گا۔ فن کی اس اسجد سے ناواقف ہونے کے علاوہ ہندوستان میں معمار کو یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ سلسلہ دینے کی غرض سے ہی تو لکھنی ضرور زیادہ چوڑی ہونی چاہئے اور شیخ سے آسانی کے ساتھ بنانا منظور ہے تو اسے اتنا دبیر نہ ہونا چاہئے جو ہندوستان کی برسات میں مشکل سے تھم سکتی ہے۔ دوسرے اہل ہند کے خیال میں اینٹ کے ستون لازماً اتنے موٹے ہونے چاہئیں کہ اطالوی طرز میں عموماً اس قدر موٹے نہیں ہوتے۔ تیسرے ایسے ملک میں جہاں دیکھ سے سج جائے تو بھی لکڑی بہت جلد فرسودہ ہو جاتی ہے، چوبلی سرستون بدترین چیز سمجھے جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ مغربی فن کے اصول سے ناواقفیت اور دوسری طرف تعلیم کمیرے ملک کی آب و ہوا اور ضرورتوں کی مناسب کیا چیز ہوگی یہ لکھ ہندوستان کے معمار کو لامحالہ خلطہ بحث میں مبتلا کر دیتی ہیں بلکہ ہمارے (یعنی انگریزوں کے) ہاں تعلیم اور تجربے سے جو شوق پیدا ہوتا ہے۔ اہل ہند میں محض تقلید اور ایک ہی وضع کی پابندی کا جذبہ ایسی ریس کرنے کی کافی وجہ بن جاتا ہے۔ یہی اپنے سے بہتر چیز کی نقالی کی فضول کوشش ہے کہ انھوں نے اپنے خوبصورت طرز کو چھوڑ دیا اور بد ذوقی اور گنوارین کی وہ عجیب و غریب معجون مرکب تیار کی جو لکھنؤ اور دوسرے مقامات میں ہمیں نظر آتی ہے نہ

کھلتے کے بابو اور لسی راجاؤں نے زیریں بنگالے میں اپنے رہنے کے لئے جو بڑی بڑی سرزمینیں تیار کیں ہیں، وہ عموماً اسی مخلوط طرز میں ہیں اگرچہ ان میں بھدے پن کی شان مستند ہے۔ لیکن غالباً اس کی سب سے حیرت انگیز مثال وہ حویلی ہے جو دہلی کے آخری بادشاہ نے خود اہل قلعے میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ شاہجہاں کے اس دیوان خاص کے عقب میں تھی اور اس سے ابھری ہوئی نظر آتی تھی جس کو سخت طاؤس رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا اور جو سن و تھل کے اعتبار سے اس صنف کی بہترین عمارت عالم میں شمار ہوتا ہے۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی فن تعمیر کے اس بے بہا نمونے کے اوپر اینٹ اور چونے کی ایک چھوٹی سی عمارت نظر آتی تھی جسے سمار نے اپنے نزدیک ڈوڑک طرز میں بنایا اور اطالوی درجوں میں ونسی پٹ لگائے تھے۔ پوری عمارت پر ہر، حاشیے پر سُرخ اور نقش و نگار پر زور نہ رکھا گیا تھا، غرض ہالینڈ کی کسی نہر کے کنارے پر جو منگلے گرمی گزارنے کے لئے بنے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اتنے بدنام نہ ہوں گے۔ جتنی کہ یہ عمارت تھی۔ پھر اس محل کی سادگی اور جمال کے مقابلے میں جو صاف شفاف سنگ مرمر کا بنا ہوا سامنے موجود تھا، یہ زبان حال سے جس کے سمجھنے میں کسی کو دوہو کا نہیں ہو سکتا، صاف صاف بتاتی تھی کہ آج اس سخت پر جلوس کرنے والے کس درجہ ذلیل و خوار ہو چکے ہیں جہاں کبھی ان کے اسلاف یعنی خاندان تیموری کے وہ نامور فرماں روا رائج کرتے تھے جنہوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور اس کے شہروں کو ان بے مثل و بے عیب عمارات سے مزین کیا جن کی کیفیت اس کتاب کے ایک جداگانہ جزو میں تحریر کی جا چکی ہے۔

اسی قسم کی عمارتوں میں جن تک یورپ کا بڑا اثر نہیں پہنچ سکا اور جو انہی اسلاف کی یادگاروں میں محسوب ہونے کے لائق ہیں، ان کو لکھنؤ میں بھی

چند عمارتیں بنائی جاتی ہیں: جیسے وہ بڑا امام باڑہ کہ گو تفصیلی امتحان کی تاب نہیں لاسکتا، تنہا ہم اتنے بڑے پیمانے پر بنایا گیا ہے کہ قدیم تر عہد کے کاموں کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔ اسے اودھ کے چوتھے نواب آصف الدولہ نے قحط زدوں کی امداد کے لئے ۱۸۴۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔

خاکہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا بڑا دالان ۱۶۲ فٹ لمبا اور ۵۳ ۱/۲ فٹ چوڑا ہے۔ دونوں طرف کے پیش یا برآمدے ۲۶ ۱/۲ و ۲۱ ۱/۲ فٹ عریض ہیں اور دونوں سروں پر بہت پہلو کمرے بنائے ہیں جن کا عمود ۵۳ فٹ ہے دوسرے لفظوں میں آثار چھوڑ کر پور اطول ۲۶۳ اور عرض ۱۲۵ فٹ ہوا۔ اس وسیع عمارت کو سادہ وضع اور سادہ تراخت کے لداؤں سے بنایا ہے جن کو اینٹ اور مٹی کے سانچوں پر فکر کوٹ کر کئی فٹ موٹی تہ دہی تھی اور یہ سانچے سال سال دو، دو سال تک کھڑے رہنے دیئے تھے کہ چھت خوب جم جائے اور سوکھ جائے۔



خاکہ (۲۲۵)

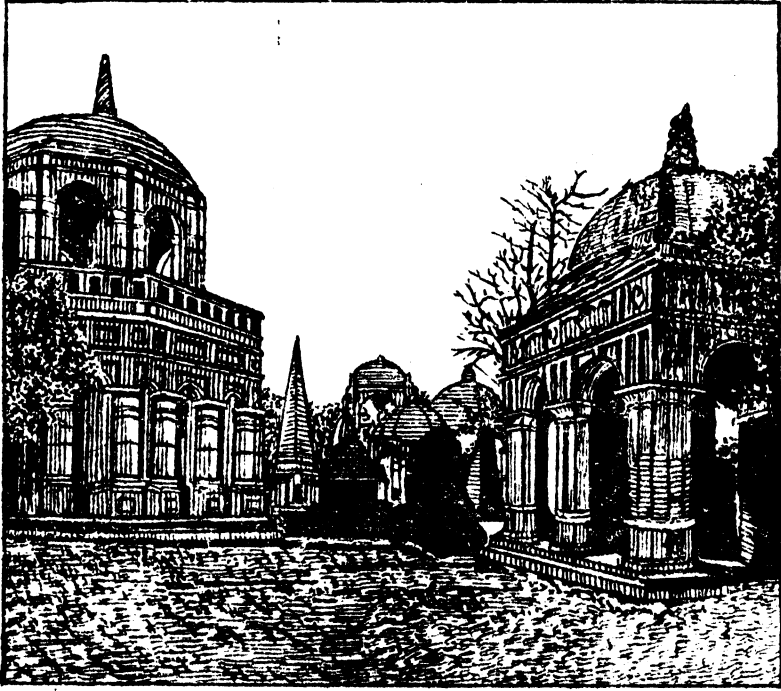
پھر اس بھرت کو نکال دیا تو پورا لداؤ ایک جان ہو کر قائم رہ گیا جس میں چال کرنے یا ٹاک پڑنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور نظام ہریکپ کے غوطی لداؤ سے بھی زیادہ پائدار و بہتر صورت چھت بنانے کی شکل آئی۔ دوسرے اس کے سادہ اور ارزاں تر ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کیونکہ

یہ فی الواقع مٹی کے سانچے پر تیار کی جاتی ہے جس کو سمار اپنی پسند کے موافق جس شکل میں چاہے مرتب کر لے۔

یورپ کے لوگ جو شروع شروع میں ہندوستان آکر آباد ہوئے، وہ فرنگستان سے کچھ ایسے جلاوطن اور بے تعلق سے ہو گئے تھے کہ انہوں نے بہت سی عادات اور خیالات انہی لوگوں کے اختیار کر لئے جن کے درمیان وہ رستے سستے تھے۔ ان خاص خاص عادات میں ایک عجیب شوق شاندار قبریں بنانے کا بھی انہیں لاحق ہو گیا اور سورت و احمد آباد وغیرہ مغربی سواحل کے ان مقامات پر جہاں فرنگی لوگ شروع میں آکر بسے، ہم دکنڈزوں اور انگریزوں کی سترہویں صدی کی قبریں دیکھتے ہیں جو وسعت میں مسلمان امرا کی مد مقابل اور صورت میں انہی سے مشابہ ہیں لیکن غور سے معائنہ کیجئے تو ان کی جزئیات بہت ناقص ثابت ہوں گی۔ اصل میں ادھر تو ان کے معماروں کو اتنا خیال تھا کہ ستون، گول اور کمانیں مدور ہوتی ہیں اور دوسری طرف وہ مغربی روکار کی بھی دھندھلی سی یاد رکھتے تھے لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کاغذ پر نہ کھینچ سکتے تھے اور نہ زبانی اپنا مطلب پوری طرح سمجھا سکتے تھے کہ دسی راج اسے درست ناسکیں نتیجہ یہ ہوا کہ قبض جگہ ہیں بارہ ستون پر جن کی کوئی وضاحت ہی نہیں لکھند بنے ہوئے ملتے ہیں اور بعض جگہ ایسے ہندو متی اجزا غلط ملط کر دیئے گئے جن کا کوئی نام نہیں اور جن کی تمیز کا طریقہ دیکھ کر پریشانی ہوتی ہے کہ الہی یہ شے کس طرح بنائی گئی اگرچہ اس میں ایک قسم کی بوقلمونی ضرور آگئی ہے۔ یہ سب عمارتیں اینٹ چونے سے بنی تھیں لہذا بہت سی گرگر کھنڈر ہو گئی ہیں البتہ سرچورج اور کونڈین (متوفی ۱۶۶۹ء) اور اس کے بھائی کرستوفر کے مقبرے سورت میں اب تک سلامت اور بامرمت حالت میں ہیں اور انگلستان میں بنائے جائیں تو لوگ دنگ رہ جائیں۔ اس میں سرچورج کے مقبرے کے اندر اس کے بھائی کرستوفر کی چھتری ہے لیکن زیادہ وسیع اور رفیع اشان عمارت اس کے نامور بھائی کا مقبرہ ہے جو دو منزلیہ، ۴۴ فٹ اونچا اور ۲۵ فٹ



قطر کا ہے۔ بعض دوسرے مقبرے خصوصاً وہ جو زیادہ پرانے ہیں، بہتر مذاق کا ثبوت دیتے ہیں اور جن ہندوستانی نمونوں کی نقل ہیں، ان سے فی الجملہ زیادہ مماثلت رکھتے ہیں۔



تصویر (۲۴۱)

قیاس آرائی کے لئے یہ بھی بہت دلچسپ اور نادر موضوع ہو گا کہ اگر فرنگیوں کا

لے ایڈمرسن "انگلش ان ویٹرن انڈیا" وغیرہ تورت کے ولنیزی قبرستان میں بیرن فائن ریڈ کے مقبرے کی نسبت کہا جاتا ہے کہ شان و شوکت میں سب سے بڑھاڑھا ہوا تھا تو لے "ہسٹری... آرکیٹیکچر دوم" ۲۸۹

کسی قسم کا اثر نہ ہوتا تو ہندوستان میں اسلامی طرز تعمیر کا انجام کیا ہوتا؟ اس تحقیق کے واسطے مصاحف وافر نہیں ہے تاہم اوزنگ زیب کی وفات سے قبل ہی انحطاط فن کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اٹھارویں صدی گزرنے کے بعد آگرہ اور دہلی میں جو مکانات ایسے بنے کہ ان تک فرنگی اثر کا کوئی شائبہ تک نہیں ملتا، ان میں بھی ایک خاص قسم کا ضعف اور صحت نظر کی کمی پائی جاتی ہے اگرچہ کبھی کبھی حسن و نفاست کی بھی خاصی ممتاز شان آئی ہے۔ مگر اس زمانے کے بعد تو مزید غور و بحث کا موقع ہی باقی نہیں رہتا کیونکہ یا تو مستقل طور پر کسی نئے طرز کے وجود میں آنے سے قبل (فرنگی اثرات نمایاں ہیں اور یاد و دوست گوشتوں میں انحطاط بغیر کسی بیرونی اثر کے بالکل صریح و واضح ہو گیا ہے جیسا کہ ابھی بیان ہوا، میسور کی حالت ایک حد تک یہی ہے البتہ جو ناگڑھ (گجرات) میں ایک مجموعہ مقابر موجود ہے جو گذشتہ صدی میں بلکہ بعض نوچلین سچاس برس پیشتر ہی تعمیر ہوئے تھے ان میں فن عمارت کی جو اوضاع و اسکا نمایاں ہیں، جہاں تک مجموعہ واقفیت ہے وہی قریب ترین صورتیں ہیں جو یہ اسلامی طرز تعمیر ان دنوں اختیار کر رہا تھا۔ بے شبہ اس کے نقش و نگار اور جزئیات ایک خاص قسم کی نفاست سے خالی نہیں ہیں۔ درجوں کی جالیاں اکثر کمال نظر فریب ہوتی ہیں اور نقاشی کا سارا کام پوری صحت اور حسن تناسب کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔ مگر یہ سب چوبی کام ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ ساری نقاشیاں اور ضامیاں سنگین عمارت کی نسبت کسی الماری یا مسبہری یا اور اسی قسم کے ساز و سامان کے واسطے زیادہ موزوں ہوتیں گے پھر گنبدوں کو دیکھئے تو مشکل سے تپہ چیلگا کہ یہ ترک و افغان تباؤں کی پر جلال و عظمت اوضاع کے یادگار ہیں۔ کنگوروں میں طفلانہ جذبہ کی مہیاں اور دیوارگیریاں کام کی بجائے زیادہ تر ناشی بناوی ہیں حقیقت میں یہ ایسا طرز رہ گیا ہے جو تعمیر کے صحیح اصول سے بے تعلق ہو کر اب اپنی کامیابی کے لئے محض تکلف و آرائش کا رہن منت ہے لیکن جب اصل شے ہی کچھ نہ ہو تو پھر خالی بناؤنگار سے حسن تناسب کی وہ کمی پوری نہیں ہو سکتی جو ایسی

عمارت میں لامحالہ پائی جاتی ہے جو ختم کرتے وقت (جس میں اس فن کے اپنی فن تعمیر کی اس تاریخ کو ختم کرتے وقت) جس میں اس فن کے صرف ان آثار و شیون سے بحث کی گئی ہے جو ہندوستان کی حدود میں ظاہر ہوئے) یہ عجیب و سبق آموز نکتہ بھی لکھنے کے لائق ہے کہ ہم کوری طرح ایک دائرے ہی میں چکر کھاتے رہے۔ یہ بیان شروع تو یوں ہوا تھا کہ کس طرح مسیح علیہ السلام سے دو سو برس قبل ایک چوبی طرز نے آہستہ آہستہ سنگی اوضاع و اشکال اختیار کیں اور بتدریج ایسا طرز بن گیا کہ پھر اسے دیکھ کر اس کے کبھی چوبی ہونے کا پتہ بھی نہ چل سکتا تھا لیکن اب اس بیان کا خاتمہ اس قول پر ہوتا ہے کہ ہل نہیں بجا پورا یا دہلی کا طرز عمارت آخر میں پھر انہی اوضاع کی طرف عود کر رہا ہے جو فنِ سناری کو زیادہ زیب دیتے ہیں نسبت ایسی سناری کے، جیسی بھڑت یا سانچی کے بڑے دروازوں میں صرف کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ بات بھی قابلِ بحث ہو سکتی تھی کہ ہندوستانی طرز عمارت اسی غلط روش پر چلتا رہا تو آیا وہ غالباً بالکل نیست نابود ہو جائے گا یا نہیں؟ لیکن اب اسی تحقیق بیکار ہے کیونکہ لکھنؤ وغیرہ کی مثال سے صاف ثابت ہے کہ اس طرز تعمیر کی موت بیرونی طرز کی نقالی سے واقع ہو گئی تھی۔

لے حقیقت میں یہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی تعمیر کو پوری طرح ہندی اثرات سے متاثر کہہ سکتے ہیں۔  
مترجم۔

# باب یازدہم

## چوبی طرز تعمیر

موضوع : مسجد شاہ بہدان، سری نگر (کشمیر)

(۳)

ہندوستان میں جو نقلی چوبی طرز مروج ہوا، اور جس کا ہم ابھی ذکر کر رہے تھے، وہ محض انحطاط و کھنگی کی علامت تھا لیکن اس سلسلے میں اگر ہم اس داستان کو اصلی چوبی طرز کے تذکرے پر جیسا کہ وہ کشمیر میں مروج ہے، ختم کریں تو زیادہ لطف و انبساط کا موجب ہو گا۔ شہر سری نگر کی جامع مسجد وسیع و قابل لحاظ عمارت ہے اور گوتنی شان و شکوہ نہیں رکھتی جس قدر بعض وہ مساجد جن کا گذشتہ ابواب میں حال بیان ہوا تھا ہم اس میں بڑی عجیبی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ شروع سے اسے خالص چوبی ہی بنوایا گیا ہے اور اسی لئے اس کی خصوصیات کی مطالعے سے بہت سے ایسے مسائل کے حل کرنے میں ہمیں بڑی مدد ملتی ہے جو ہندوستان کے طرز تعمیر کی تاریخ مرتب کرنے میں پیدا ہوتے ہیں افسوس یہ ہے کہ یہ مقبول عام مسجد نہیں ہے اور ایک ہزار ایک (فرنگی) سیاحوں میں سے جو وادی کشمیر کی سیر کرتے ہیں، کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا اور نہ اب تک کسی تصویر کش نے اپنا مصورہ (کیمرا) اس کی حدود میں لاکے لگایا ہے۔

اگر لفظ کول ان نقشوں اور عمارتی جزیات کو جو پہلے خزل کننگیم چھاپ چکے تھے دوبارہ چھاپنے کی بجائے اس غیر صرف عمارت کا ہی نقشہ ان نقش و نگار کے نمونے ہیں مہیا کر دیتے تو یہ ایسی خدمت ہوتی کہ اب ان کے احسان مند ہوتے پڑتے۔ مجھے اس سجد کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا وہ کرنل مونٹگومری کی گفتگو سے اخذ کیا گیا ہے۔

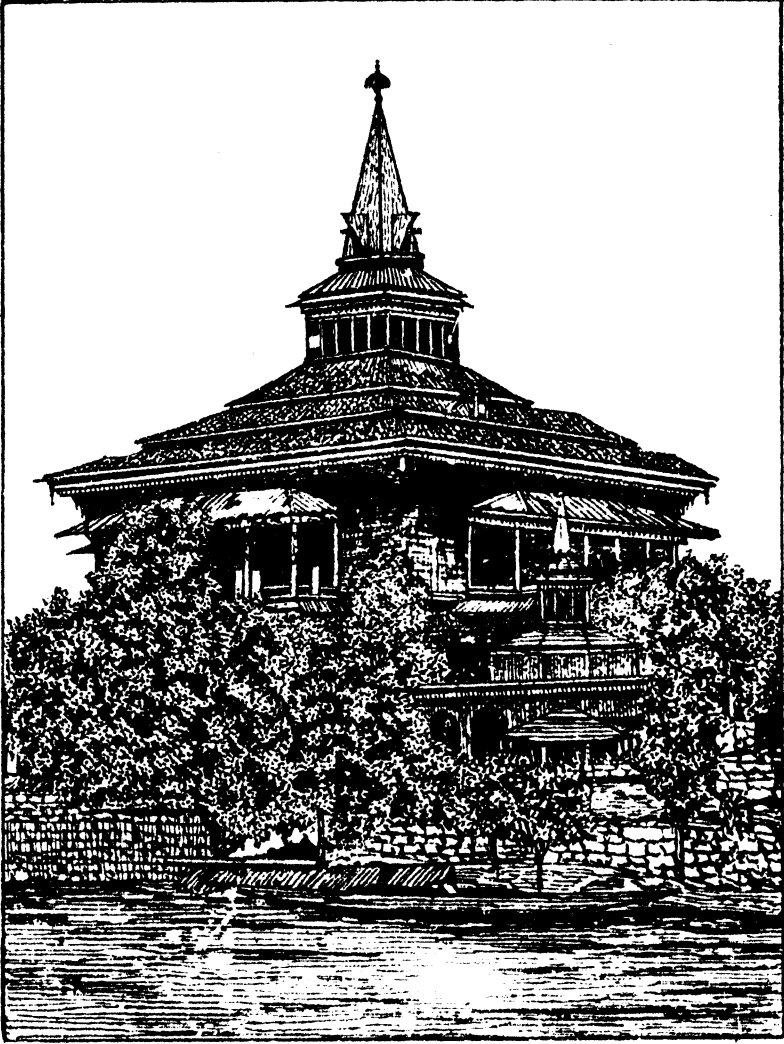
اس کا نقشہ وہی عام نقشہ ہے کہ بیچ میں صحن اور مشرق کی طرف تین گہ کا اور باقی رُخ چار چار گہ کے دالان لگے بنائے ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تمام ستون دیو دار کے ہیں اور یہ محض پتھر یا سنگی ستونوں کی نقل کے نہیں بلکہ اصلی اور بے ریا چونی ستون ہیں جیسے برما کی خاتقاہوں وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر نقش و نگار میرے نزدیک بہت خوبصورت و پر تکلف اور فرسودگی کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ابھی تک نہایت دلفریب ہیں۔

شہر میں ایک اور مسجد شاہ جہان والی مشہور ہے اور یہ بھی تمام و مکمل چونی بنائی گئی ہے۔ دوسرے جامع مسجد سے بہت چھوٹی ہونے کے باوجود اس میں یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ اس کی چھت غالباً آرتانہ کے مندر کی قدیم چھت سے مشابہ ہے اور دوسرے چونی پر جو عجیب وضع کا کلس ہے وہ بھی بدھوں کی ”تہٹی“ کی یاد دلاتا ہے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں بہت کچھ تصرف کر دیا گیا ہے تاہم مثال کے طور پر سوئیٹام بھونا تھ (نیپال) وغیرہ مقامات میں تہٹی کی جو شکلیں ملتی ہیں ان سے کچھ بہت مختلف نہیں ہیں۔

دیواریں بھی ہماری دھپسی کا موجب ہیں کہ ان میں شہتیروں کو جس طرح جمایا اور آراستہ کیا ہے وہ پتھر کی کسی دوسری چٹائی سے مشابہ ہونے کی نسبت جہاں تک ہیں یاد آتا ہے اُسیہ کے مندروں سے بہت صاف مشابہت رکھتے ہیں۔ بھو اینور کے بڑے مندر کے برج میں

تصویر بھونور

۱۔ یہ عبارت کچھ غلط معلوم ہوتی ہے مسجد میں تین طرف چار چار گہ کے دالان کہیں نہیں ہوتے، ترجمہ۔



تصویر (۲۴۲)

اور اسی طرح وہاں کے بعض دوسرے مندروں میں جس طرح رتو سے جمائے  
ہیں، ان سے قریب قریب وہی کیفیت مترتب ہوتی ہے جیسی ان چولی دیواروں  
سے۔ لہذا یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ ان کی وضع کسی ایسے ہی قدیم نمونے

سے اخذ کی گئی ہو۔ اس کے علاوہ اڑسیسے کے مندروں میں جس طرز کے  
بیل بوٹے تراشے ہیں اور اس طریق تزئین کو جس حد تک وسعت دی ہے  
وہ بھی پتھر کی بجائے زیادہ تر کسی چونی صلیت کا خیال دلاتی ہے جو  
مگر ان مسائل پر اسی وقت کوئی مفید بحث ہو سکتی ہے جب کہ ہمیں  
اس کشمیری طرز کے متعلق موجود معلومات سے کچھ زیادہ واقفیت بہم  
پہنچ جانے۔ البتہ جب اس مقصد کے لئے ضروری مواد فراہم ہو جائے گا تو  
پتھر اس اصلی اور نقلی چونی فن تعمیر کے بارے میں ایسے ابواب لکھنے ممکن  
ہوں گے جو نہایت ہی دلچسپ اور ہندوستان کی تاریخ طرز تعمیر کا نمونہ بن  
نہتہ ہوں گے اگرچہ اب بھی اس تاریخ کا اسی چونی فن کے ذکر سے آغاز  
اور اسی پر ختم ہوتا ہے جو





# صحت نامہ

## ”اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں“

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۸	۸	اند	ماند
۴۹	۱۶	کمان	گمان
۶۹	۲۴	میں	ہیں
۷۰	۲	سیہ	سید
۱۳۶	۱۰	نو اور افراد	نو اور افراد
۱۴۹	۶	ہو رہے	ہو رہے
۱۷۴	۱۸	کی سامنے	کے سامنے
۱۸۳	۱	کے خلاف ورزی	کی خلاف ورزی
۱۸۷	۱۹	ضرورتوں کی مناسب	ضرورتوں کے مناسب
۱۸۷	عاشیہ سطر (۱)	قبرستان	قبرستان
۱۸۹	۱۰	اپنی او ضاع	انہی او ضاع
۱۹۰	۱۱	کی مطالعے	کے مطالعے
۱۹۳	۶	بہم پہنچ جانے	بہم پہنچ جائے







